خط و کتابت کورسز

اپنی نوعیت کے ۳ منفرد خط و کتابت کورسز میں

داخلہ جاری ہے

- قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی
  پر مبنی کورس جو بذریعہ کیسٹس کرایا جاتا ہے۔
- عربی گرائمر خط و کتابت کورس (I, II, III)
- ترجمہ قرآن کریم کورس

داخلہ کے خواہشمند حضرات پراسپکٹس اور
دیگر تفصیلات کے لئے درج ذیل پتہ پر رابطہ کریں :

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون : 3-5869501

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

K-36

ماہنامہ

حِکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۶ | صفر المظفر ۱۴۱۸ھ — جون ۱۹۹۷ء | شمارہ ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زر تعاون -/۸۴ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

موتُ العالِمِ موتُ العالَم

پروفیسر احمد یار احمد صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا اور دل لرزتا ہے' لیکن ان بعض تلخ حقائق میں جن کا اس حیات مستعار کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے' انہی میں ایک موت بھی ہے کہ جس سے کسی ذی حیات کو مفر نہیں۔ "کل نفس ذائقہ الموت" کے قاعدہ کلیہ سے انبیاء و رسل مستثنیٰ نہیں تو اور کوئی اس ضابطے سے ماوراء کیونکر ہو سکتا ہے۔

حافظ صاحب مرحوم ۱۵ مئی کی شب ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ قریباً تین ماہ قبل ماہ رمضان المبارک کے دوران ان پر بیماری کا شدید حملہ ہوا تھا۔ وہ گزشتہ کئی برسوں سے ایک خاص نوع کے عارضہ قلب میں مبتلا تھے جس کے زیر اثر ان کے نظام تنفس میں مستقل نقص پیدا ہو چکا تھا۔ ادویات کے مسلسل اور باقاعدہ استعمال کے باعث مرض ایک حد تک کنٹرول میں تھا اور ڈاکٹروں کی سختی سے ہدایت تھی کہ دوا کا ناغہ نہ ہونے پائے۔ روزہ رکھنے کی انہیں ڈاکٹروں کی طرف سے قطعاً اجازت نہیں تھی۔ اس رمضان سے قبل وہ اپنی صحت کچھ بہتر محسوس کر رہے تھے' چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر حضرات کے مشوروں اور ہدایات کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے روزے رکھنے شروع کر دیئے۔ اغلباً یہ چودھواں روزہ تھا جب افطاری کے بعد ان کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ فوری اور ہنگامی علاج سے وقتی افاقہ تو ہوا لیکن عیدالفطر کے فوراً بعد وہ تکلیف عود کر آئی۔ اس بار بیماری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ ہسپتال داخل کرنا ناگزیر ہو گیا اور پھر ۱۴/ فروری سے ۲۴/ مارچ تک وہ مسلسل چالیس روز پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں زیر علاج رہے اور اس دوران ان کی صحت کی مخدوش کیفیت کے پیش نظر زیادہ عرصہ انہیں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا۔ اس دوران ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب دل نے اچانک کام کرنا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹروں کے بقول وہ زندگی کی سرحد پھلانگ کر موت کی حدود میں داخل ہو چکے تھے کہ بالآخر دل کو حرکت دینے اور سانس کی آمد و رفت بحال کرنے کی ہنگامی اور مصنوعی کوششیں بارآور ہوئیں۔ نوشتہ تقدیر میں ان کے لئے جو وقت معین تھا اس میں شاید ابھی کچھ روز باقی تھے۔ حافظ صاحب کے چھوٹے بیٹے کرنل ذوالقرنین جن کی رہائش راولپنڈی میں ہے اور چاروں بیٹیاں اور داماد تو اس پورے عرصے میں حافظ صاحب کی خدمت اور دیکھ بھال کے لئے موجود تھے ہی' بڑے بیٹے ڈاکٹر نعم العبد بھی ہنگامی بنیادوں پر چھٹی لے کر ریاض

(سعودی عرب) سے لاہور پہنچ گئے تھے اور اپنے والد کی خدمت کے لئے ہمہ وقت موجود تھے۔ ۲۴/مارچ کو ڈاکٹروں کی اجازت سے انہیں ہسپتال سے گھر منتقل کر دیا گیا۔ اس پورے عرصے میں معدے کی حساسیت کے باعث چونکہ کوئی ٹھوس غذا معدے میں ٹھہرتی نہیں تھی بلکہ فوراً قے ہو جاتی تھی اور صرف چند گھونٹ پانی' شربت یا چند چمچ دودھ بمشکل ان کی روزانہ کی خوراک تھی' لہٰذا نقاہت اور ضعف کا معاملہ نہایت تشویشناک صورت اختیار کر چکا تھا اور ضروری تھا کہ ان کی نگہداشت کے لئے ۲۴ گھنٹے کوئی نہ کوئی فرد ان کے پاس موجود رہے۔ چنانچہ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا کہ کرنل ذوالقرنین انہیں اپنے ساتھ راولپنڈی لے جائیں۔ جہاں ہر دم خدمت کے لئے مستعد رہنے والے نرم مزاج اور نرم گفتار بیٹے ذوالقرنین کی رفاقت کے ساتھ ساتھ علاج معالجے کی بھی ہر سہولت حاصل تھی۔ چنانچہ ۲۷/مارچ کو وہ نہایت بوجھل دل کے ساتھ اپنے دونوں بیٹوں کی معیت میں راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ اپنے بیٹوں کے شدید اصرار کے باوجود ساری زندگی انہوں نے اپنا گھر چھوڑ کر کسی بیٹے یا بیٹی کے ہاں رہنا گوارا نہیں کیا تھا۔ انہیں اپنی کتابوں اور اپنے اس طویل اور کشادہ کمرے سے جس میں چاروں طرف کتابوں اور رسالوں سے بھری الماریوں کے علاوہ بھی کوئی گوشہ اور کوئی انچ' سوائے کمرے میں بچھی ہوئی ان کی چارپائی اور جائے نماز کے' کتابوں سے خالی نظر نہ آتا تھا' اتنا دلی لگاؤ اور تعلق خاطر تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان سب سے الگ ہو کر کہیں اور رہنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لاہور سے روانگی کے وقت وہ اپنے عزیز و اقارب سے اور راقم السطور سے بھی یہ کہہ کر گئے تھے کہ "جیسے ہی میری صحت کچھ بہتر ہوئی میں فوراً واپس آ جاؤں گا' اور میرا اندازہ ہے کہ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد میری واپسی ہو جائے گی"۔ راولپنڈی میں وہ بمشکل ڈیڑھ ماہ ہی مقیم رہ سکے۔ اس دوران ان کی مجموعی صحت میں قدرے افاقہ تو ہوا لیکن سانس کی تکلیف پر قابو نہ پایا جا سکا۔ ۱۴/مئی کو طبیعت اچانک بہت بگڑ گئی۔ ہسپتال داخل کرایا گیا لیکن طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۵/مئی کو رات دس بجے وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وفات کے وقت حافظ صاحب مرحوم کی عمر قریباً ۷۷ برس تھی۔

حافظ صاحب کا انتقال شب جمعہ میں ہوا۔ جمعہ کے دن صبح ۱۰ بجے میت لاہور پہنچی۔ ان کی نماز جنازہ' نماز جمعہ کے فوراً بعد مسجد دارالسلام میں ادا کی گئی جہاں آج سے ربع صدی قبل وہ مسلسل کئی سال جمعہ کی خطابت کی ذمہ داری نبھاتے رہے ہیں۔ مرکزی انجمن کے صدر موسس اور امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازہ سے قبل حافظ صاحب کی خدمات قرآنی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز بھر آئی اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ حافظ صاحب مرحوم کے بارے

میں محترم ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ نہایت بامعنی اور مناسب حال ہیں کہ "وہ ایک سچے عاشق قرآن اور خادم کتاب مبین تھے"۔ جمعہ کی برکت سے نماز جنازہ میں ڈیڑھ دو ہزار افراد شریک تھے۔ حافظ صاحب مرحوم کی تدفین ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں ہوئی۔ ان کا آبائی قبرستان اگرچہ جھنگ میں ہے لیکن حافظ صاحب کی اپنی خواہش کے مطابق انہیں قرآن اکیڈمی کے قریب ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ یوں علوم و معارف قرآنی کا ایک گراں قدر باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

قارئین "حکمت قرآن" میں سے اکثر کا حافظ صاحب مرحوم سے تعارف ان کے بلند پایہ علمی اور نہایت مفید تحقیقی کام "لغات و اعراب قرآن" کے حوالے سے تھا۔ تاہم قارئین کی ایک اچھی تعداد وہ بھی ہے جنہیں عربی زبان اور دیگر علوم قرآنی کے حصول کے ضمن میں قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج میں حافظ صاحب سے براہ راست استفادہ کا موقع بھی ملا۔ خواہش یہ تھی کہ حافظ صاحب مرحوم کے مختصر حالات زندگی بھی شامل شمارہ کر دیئے جائیں اور مرحوم کی شخصیت کے بارے میں راقم السطور کے ذاتی احساسات و تاثرات بھی ضبط تحریر میں آ جائیں۔ اس لئے کہ گزشتہ دس بارہ سالوں کے دوران راقم کا حافظ صاحب مرحوم سے جو رابطہ اور قرب رہا اور حافظ صاحب کی جو شفقت اسے حاصل رہی' اس کے پیش نظر قلم بہت کچھ لکھنے کے لئے بے قرار ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہوا تو یہ قرض آئندہ ماہ چکا دیا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

"لغات و اعراب قرآن" کی قسط اس بار شامل شمارہ نہیں کی جا سکی۔ حافظ صاحب مرحوم کی تیار کردہ ابھی چند مزید اقساط ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہماری پوری کوشش ہو گی کہ یہ سلسلہ بند نہ ہونے پائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون باصلاحیت صاحب ہمت اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے وقت کا ایثار کرنے اور جان کھپانے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ حافظ صاحب مرحوم کو اس کا صلہ اور اجر عطا فرمائے اور اس کام کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنا دے۔ (آمین)

★★★

دروس ۷

نورِ ایمان کے اجزائے ترکیبی

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سُورۃ النّور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ، مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ، اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ، اَلزُّجَاجَۃُ کَأَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لاَّ شَرْقِیَّۃٍ وَّلاَ غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ، نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ، یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ، وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ، وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ o فِیْ بُیُوْتٍ أَذِنَ اللّٰہُ أَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ o رِجَالٌ لاَّ تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلاَ بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَإِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَإِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ، یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْأَبْصَارُ o لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ ، وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ o وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا أَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَۃٍ یَّحْسَبُہُ الظَّمْاٰنُ مَآءً، حَتّٰٓی إِذَا جَآءَہٗ لَمْ یَجِدْہُ شَیْئًا وَّوَجَدَ اللّٰہَ عِنْدَہٗ فَوَفّٰىہُ

حِسَابَهُ، وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ o أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ، ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ، إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا، وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُورًا فَمَالَهُ مِنْ نُّوْرٍo

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ! رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي o وَيَسِّرْلِي أَمْرِيo وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي o يَفْقَهُوا قَوْلِي o

آج ہم قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے ساتویں درس کا آغاز کر رہے ہیں جو مباحثِ ایمان کے ضمن میں تیسرا سبق ہے اور سورۃ النور کے پانچویں رکوع پر مشتمل ہے۔

سابقہ درس میں اولوا الالباب یا صدیقین کے شعوری اور اکتسابی ایمان کی وضاحت ایمان عقلی اور ایمان سمعی کے تدریجی مراحل کے حوالے سے ہوئی تھی۔ سورۃ النور کی مشہور "آیتِ نور" (آیت نمبر ۳۵) میں اس ایمان کو ایک نور قرار دے کر اس کی اصل حقیقت کو اس کے دو اجزائے ترکیبی یعنی "نورِ فطرت" اور "نورِ وحی" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس آیہ مبارکہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"اللہ ہی آسمان و زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو' چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمکدار ستارے کی مانند روشن ہو۔ وہ چراغ جلتا ہے ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو' خواہ اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ روشنی ہے روشنی پر۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے ـــــ اور اللہ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ (یعنی وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہے!)"

یہ آیۂ مبارکہ پورے قرآن مجید میں بھی ایک منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ بالخصوص سورۃ النور میں تو اس کی حیثیت بالکل ایسے ہے جیسے ایک نہایت قیمتی اور خوبصورت انگوٹھی ہو'

جس کے درمیان میں نہایت قیمتی نگینہ جڑا ہوا ہو۔ اس لئے کہ یہ سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورۃ النور کل نو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ گویا پانچواں رکوع اس کے عین وسط میں واقع ہے' چار رکوع اس سے قبل ہیں اور چار اس کے بعد۔ اس رکوع میں ایمان اور اس کی اصل حقیقت کو تمثیلات کے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں "ایمان کی حقیقت" اور اس کی "ماہیت" کے لئے تمثیل لائی گئی ہے کہ وہ ایک نور ہے' ایک روشنی ہے جس سے انسان کا قلب' اس کا سینہ اور نتیجتاً اس کا پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اس نور کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک وہ نور فطرت جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے اور دوسرا نور وحی جس سے نور فطرت کی تکمیل ہوتی ہے۔

تمثیل یا تشبیہ کا استعمال کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں تمثیلوں اور تشبیہوں کو اس قدر کثرت سے کیوں استعمال فرمایا گیا یہ بات ہمیں جان لینی چاہئے کہ یہ معاملہ صرف قرآن مجید ہی کا نہیں ہے بلکہ یہ تمام آسمانی کتابوں کا مشترک وصف ہے۔ خصوصاً انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے بیان ہوئی ہیں' جو نہایت اعلیٰ اور حد درجہ معنی خیز ہیں اور دنیا کی اکثر زبانوں کے کلاسیکل ادب میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ آسمانی ادب میں ان تمثیلوں کے بکثرت استعمال کا سبب یہ ہے کہ بعض مضامین اتنے لطیف ہوتے ہیں اور فہم و ادراک کی عمومی سطح سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اولاً تو ان کو صراحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ثانیاً' اگر انہیں عام انداز میں بیان کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہو جائے اور عوام الناس کسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں۔ دوسری طرف ان لطیف اور ماورائی حقائق کا ایک اجمالی تصور انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے۔ لہٰذا آسمانی کتابوں میں ایسے حقائق کے ضمن میں تمثیل یا تشبیہ کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ اس سے ہر شخص اپنے فہم و شعور کی سطح کے مطابق استفادہ کرے۔ چنانچہ انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک حواری نے سوال

کیا کہ "استاد! آپ تمثیلوں میں گفتگو کیوں کرتے ہیں؟" حضرت مسیحؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: "تاکہ وہی سمجھیں جن کا سمجھنا مفید ہے"۔ حاصلِ کلام یہ کہ تمثیل کی احتیاج انسان کو ہے اللہ کو نہیں۔ جیسے زیر مطالعہ آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ یعنی "اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اور اللہ کو تو تمام چیزوں کا علم ہے"۔ اور یہ علم "کَمَا حَقُّہٗ" بھی ہے اور "کَمَا ھِیَ" بھی۔ ہر شے کی اصل حقیقت اس پر روشن ہے۔ پس تمثیل کی احتیاج معاذ اللہ ثم معاذ اللہ 'اللہ کو نہیں بلکہ اس کی ضرورت اصلاً ہمیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال بھی آپ کے سامنے آجائے تو مناسب ہوگا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانون اسلامی کی بنیاد صرف قرآن مجید پر نہیں ہے بلکہ سنتِ رسول ﷺ بھی اس کی دوسری لازمی بنیاد ہے تو بعض لوگ ناسمجھی کے باعث یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید کو سنت کی ضرورت ہے' گویا قرآن سنت کا محتاج ہے! معاذ اللہ' اصل بات یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل و معاملات میں عملی رہنمائی کے حصول کے لئے سنتِ رسول ﷺ کے محتاج ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾
(النحل : ۴۴)

"(اے نبیؐ!) اور ہم نے آپؐ کی جانب یہ ذکر یعنی قرآن مجید نازل فرمایا ہے تاکہ آپؐ لوگوں کے لئے واضح کریں جو ان کے لئے نازل کیا گیا ہے"۔

اس آیت مبارکہ کی رو سے قرآن کی تبیین' اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل کا واضح اور روشن اسوہ اور نمونہ پیش کرنا' یہ تمام امور حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات و ارشادات نیز آپؐ کے عمل اور آپؐ کی سنت کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ بالکل یہی بات یہاں ہے کہ تمثیلوں کی احتیاج اللہ کو نہیں ہے بلکہ انسان کو ہے۔ اللہ تو ہر شے سے واقف ہے' ہر شے کا علم رکھتا ہے: ﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ

لِلنَّاسِ ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ "اور اللہ مثالیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے' اور اللہ تو ہر شے کا علم رکھتا ہے"۔

کیا اللہ کی ذات' نور سے عبارت ہے؟

اب اس تمثیل پر غور کیجئے جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :
﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "آسمانوں اور زمین کی روشنی اللہ ہی ہے"۔
ظاہر الفاظ سے یہاں ایک مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید یہاں "نور" کا اطلاق باری تعالیٰ کی ذات پر ہو رہا ہے۔ اس مغالطے سے بچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہئے کہ' بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ' وہ وراءالوراء' ثم وراءالوراء' ثم وراءالوراء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم ہمارے فہم و شعور' احساس و ادراک' فکر و نظر حتیٰ کہ تصور و تخیل' کی سرحدوں سے بہت دور اور پرے ہے۔ بقولِ غالب ؎

"ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود!"

یا بقول شخصے ؎

"اے بروں از وہم و قیل و قالِ من!"

یا بقول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ : "اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الذَّاتِ اِدْرَاكٌ" یعنی اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا قرار و اعتراف ہی اصل ادراک ہے۔ گویا "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!" یعنی جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ میں اللہ کی ذات کو نہیں جان سکتا تو یہی کمال عرفان ہے۔ یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ : "وَالْبَحْثُ عَنْ كُنْهِ الذَّاتِ اِشْرَاكٌ" یعنی اللہ کی ذات کے بارے میں بحث اور کھود کرید سے انسان شرک اور فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا ____ الغرض اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ آیتِ زیر درس میں وارد شدہ تمثیل اللہ کی ذات کے لئے نہیں بلکہ اس پر ایمان کی حقیقت کے بیان کے لئے ہے' گویا نور کے لفظ کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر نہیں' ایمان باللہ پر ہے۔

اس ضمن میں امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ نور لامحالہ کوئی مادی شے ہے یا کوئی عارضی کیفیت' اور ان دونوں کی نسبت باری تعالیٰ پر نہیں ہے' جیسا کہ عہدِ حاضر کے بعض مفسرین و مترجمین قرآن نے گمان کیا ہے۔ اس کی ایک قطعی اور حتمی دلیل اس آیت مبارکہ کے الفاظ میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس میں دو مرتبہ "نُورِہٖ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مرکب اضافی ہے۔ جب کسی شے کی اضافت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو وہ شے اس کا غیر ہوتی ہے۔ جیسے میں کہوں "میرا قلم" تو اس میں "قلم" علیحدہ ہے اور "میں" علیحدہ ہوں' اور نسبت اضافی میرے اور قلم کے مابین ہے۔ تو "نُورِہٖ" کے معنی ہیں "اس کا (یعنی اللہ کا) نور" ـــــ لہٰذا نور کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر درست نہیں ہے۔ اس کی ایک دوسری دلیل قطعی سورۃ الانعام کی پہلی آیت مبارکہ میں موجود ہے' جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نور سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہو سکتی۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾

"تمام شکر و سپاس' تمام ثناء و تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین' اور بنائے اندھیرے اور روشنی"

ثابت ہو گیا کہ نور "مجعول" یعنی بنائی ہوئی شے ہے اور ظاہر بات ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کو مجعول نہیں کہا جا سکتا۔

اب نور کو سمجھنے اہم جس نور سے واقف ہیں وہ "نورِ خارجی" ہے' خارجی روشنی۔ یہ نور یا روشنی اصل میں اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم سب ایک ایسے کمرے میں موجود ہیں جہاں برقی قمقموں کی روشنی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ کمرہ خوب روشن ہے اور جگمگا رہا ہے۔ اس صورت میں اسی روشنی کے ذریعے ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں' لیکن کسی سبب سے فیوز اڑ جائے اور روشنی چلی جائے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکیں گے در آنحالیکہ ہم سب کی آنکھوں میں دیکھنے کی صلاحیت موجود رہے گی۔ گویا اشیاء کا ظہور بواسطہ نور ہو رہا ہے۔ یہ ہے ہماری بصارت ظاہری جس کا ذریعہ بنتا ہے ایک مادی اور خارجی نور۔ اسی طرح ایک نور باطنی ہے جس سے حقائقِ اشیاء ظاہر ہوتے

ہیں' جیسے نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا منقول ہوئی ہے کہ : ((اَللّٰھُمَّ اَرِنی حقیقۃَ الاشیاءِ کَماھِیَ)) "اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں"۔ شاید اسی سے شاعر نے خیال مستعار لے کر کہا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

تو وہ جو ایک بصیرتِ باطنی ہے' اسے ایک نورِ باطنی کی ضرورت ہے اور وہ نورِ باطنی ہے نورِ معرفتِ خداوندی۔ اسی نورِ معرفتِ خداوندی کا ذکر سورۃ البقرہ میں آیت الکرسی کے بعد دوسری آیت میں ہے :

﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ﴾

"اللہ اہل ایمان کا دوست ہے' ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف"

گویا اللہ کو پہچان لیا تو اس کائنات کے جملہ حقائقِ کونیہ روشن ہو جائیں گے اور حقائقِ تکوینی کے ساتھ ساتھ حقائقِ تشریعی بھی اپنے جملہ اسرار و حکم کے ساتھ منور ہو جائیں گے اور ہر شے کی حقیقت نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ یہ جملہ حقائق منکشف ہو جائیں گے کہ آغاز کیا ہے؟ اختتام کیا ہے؟ وجود کی ماہیت کیا ہے؟ موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر کی حقیقت کیا ہے؟ شر کی حقیقت کیا ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ مجازات و مکافات کیوں ضروری ہیں؟ یہ ساری چیزیں انسان کو معلوم ہو جائیں گی اگر وہ اللہ کو جان لے اور اس کو پہچان لے۔ جس طرح ہماری بصارتِ ظاہری کے لئے نورِ خارجی ضروری ہے' اسی طرح بصیرتِ باطنی کے لئے نورِ معنوی ضروری ہے' جو عبارت ہے معرفتِ خداوندی یا ایمان باللہ سے۔

پہلی تمثیل۔ "مَثَلُ نُوْرِہٖ" کا مفہوم!

اب آگے چلئے' ارشاد فرمایا : ﴿مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ﴾

"اس کی روشنی کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو" ـــــ یہاں جو "نُوْرِہٖ" (اس کی روشنی) کے الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ متکلمین کی اکثریت نے اسے نورِ ہدایت قرار دیا ہے کہ یہ تمثیل نورِ ہدایت کے لئے ہے۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآن ہے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قرآن کو "نُور" سے تعبیر کیا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ یہاں نور سے مراد ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اس لئے کہ آپؐ کے بارے میں سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۴۶ میں واضح طور پر فرمایا گیا کہ آپؐ ایک روشن چراغ ہیں۔ ویسے ہم تینوں کو جمع کرلیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ ہدایت' قرآن اور رسول مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں' جیسے سورۃ البیّنہ میں ارشاد فرمایا :

﴿ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ ﴾

"یہ سارے اہل کتاب اور یہ سارے مشرکین (اپنے کفر اور شرک سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس "بیّنہ" نہ آجاتی۔"

آگے فرمایا کہ وہ "البیّنہ" کیا ہے؟

﴿ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ ﴾

"ایک رسولؐ' اللہ کی طرف سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوئی ہیں"۔

گویا رسولِ خدا اور صحیفۂ خداوندی مل کر ایک وحدت بنتے ہیں اور اس طرح "بیّنہ" وجود میں آتی ہے' اور یہ ہے اللہ کی روشن دلیل' اللہ کی حجت' اللہ کی برہان۔

"مَثَلُ نُوْرِهٖ" کے ضمن میں دو صحابہؓ کی رائے بھی نہایت قابل غور ہے۔ یہ دونوں صحابہؓ وہ ہیں جن کی قرآن فہمی کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے ہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہاں "مَثَلُ نُوْرِهٖ" سے مراد ہے "مَثَلُ نُوْرِ مَنْ آمَنَ" (مثال اس کے نور کی جو ایمان لایا) یعنی جو ایمان لے آئے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ایک نور عطا ہوتا ہے' اس نور کی مثال یہاں بیان ہو رہی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں "مَثَلُ نُوْرِهٖ" سے مراد ہے "مَثَلُ نُوْرِهٖ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ" (اس کے نور کی مثال جو

مومن کے قلب میں ہوتا ہے) گویا کہ یہاں مراد ہے نورِ ایمان ـــــ اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان حقیقی کے نور کا محل و مقام قلب ہے۔ جیسے کہ سورۃ الحجرات میں ایک جانب صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا کہ : ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ﴾ "لیکن اللہ نے ایمان کو تمہاری محبوب ترین متاع بنادیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھبادیا ہے"۔ (آیت نمبر ۷) اور کچھ دوسرے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ : ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ﴾ "اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔" (آیت نمبر ۱۴)

قلبِ مؤمن میں جو نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے آگے اس کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے۔ اب ذرا آپ غور کیجئے اور اپنے جسم کی ہڈیوں کے پنجر کو اپنے تصور میں لائیے تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں۔ "ڈایافرام" جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے وہ اس کا فرش ہے اور اس پر قلب رکھا ہوا ہے۔ جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اب یہ ایک روشن چراغ کے مانند ہے کہ : ﴿كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ﴾ "جیسے ایک طاق ہو اور اس میں ایک چراغ رکھا ہو"۔ ﴿اَلْمِصْبَاحُ فِىْ زُجَاجَةٍ﴾ "یہ چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہے"۔ ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر چراغ شیشے (فانوس) یا کسی قندیل میں نہ ہو تو چراغ کی لو ہوا سے اِدھر اُدھر منتشر ہوتی رہتی ہے۔ جب چراغ شیشے (فانوس) یا قندیل میں ہوتا ہے تو لو ایک مرکز پر مرتکز اور ایک جگہ قائم رہتی ہے جس سے روشنی بالکل یکساں طریقے اور ہموار طور پر اپنے ماحول میں سرایت کرتی ہے۔

اب آگے اس تمثیل کی اصل فصاحت و بلاغت آرہی ہے :

﴿اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّىٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِىْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾

"فانوس کی کیفیت یہ ہو جیسے چمکتا اور جگمگاتا ستارا۔ وہ چراغ جلتا ہو ایک ایسے بابرکت زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا روغن آپ

سے آپ بھڑک اٹھنے کے لئے تیار ہو' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔"

اس زیتون کے درخت کے متعلق حبر الامۃ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے زیتون کا ایسا درخت مراد ہے جو کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے یا کسی میدان میں یکہ و تنہا کھڑا ہے۔ ایسے درخت پر صبح سے لے کر شام تک مسلسل دھوپ پڑتی ہے' گویا سورج کی حرارت و تمازت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر درختوں کا کوئی جھنڈ ہو تو اگر اس کے شرقی گوشے میں کوئی درخت ہو گا تو شام کی دھوپ اس کو نہیں ملے گی اور اگر غربی گوشے میں ہو گا تو صبح کی دھوپ سے محروم رہے گا۔ یہ ہے مفہوم "لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ" کا۔ حضرت ابن عباسؓ مزید فرماتے ہیں کہ ایسے درخت کے پھل کا تیل نہایت صاف و شفاف ہوتا ہے اور اس میں روشن ہونے کی استعداد بدرجہ تمام و کمال موجود ہوتی ہے۔ آیت کے اس حصے میں زیتون کے اس درخت کے روغن کی یہ خصوصیت و کیفیت بیان ہوئی ہے کہ وہ اتنا صاف و شفاف ہے کہ بھڑکنے اور مشتعل ہونے کے لئے بے تاب ہے' مچل رہا ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ جدید دور میں اگر ہم اس کی مثال دیں تو وہ پٹرول ہے۔ مٹی کے تیل سے بھی دیا جلایا جاتا ہے' لیمپ اور لالٹین روشن کی جاتی ہے' سرسوں کے تیل سے بھی دیا جلا لیا جاتا ہے' لیکن ان سب کے لئے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے لئے بتی چاہئے' کپڑا چاہئے' تب وہ جلے گا۔ اس کو براہ راست دیا سلائی دکھائیں تو وہ نہیں جلے گا۔ اس کے برعکس پٹرول کا معاملہ ہے کہ دیا سلائی اس سے ابھی دور ہے' قریب بھی نہیں آئی لیکن پٹرول خود آگے بڑھ کر آگ کو پکڑنے اور بھڑک اٹھنے کے لئے بے تاب ہے۔ گویا یہاں ۔ "نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے!" والا انداز ہے۔

نورِ فطرت اور نورِ وحی کا امتزاج

پس اسی روغن سے درحقیقت ایک سلیم الفطرت انسان کی مثال دی گئی ہے جس نے اپنی انسانیت کے جوہر اور اپنی فطرت کی سلامتی کو محفوظ رکھا' اس میں کثافتیں نہیں آنے دیں۔ چنانچہ اس میں خواہشات و شہوات کی آلودگی پیدا ہونے دی' نہ جاہلی عصبیتوں کے

حجاب طاری ہونے دیئے۔ بلکہ وہ اپنی اصل حقیقت پر سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت کے ساتھ قائم و برقرار رہا۔ ایسے سلیم الطبع انسان کی فطرت کا یہ صاف و شفاف روغن بھڑک اٹھنے کو تیار رہتا ہے اور اگر نورِ وحی ذرا اس کے قریب آ جائے تو اس کا باطن جگمگا اٹھتا ہے۔ جیسے السّابقون الاولون صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب نورِ وحی سے فی الفور جگمگا اٹھے تھے اور ان ؓ کی فطرتِ سلیمہ نے فوراً تصدیق کر دی تھی کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے نبی و رسول ہیں۔

درحقیقت یہ مثال ان صدیقین کے ایمان کی ہے کہ جو خود بیتاب ہوتے ہیں کہ جیسے ہی توحید و رسالت کی دعوت سامنے آئے اسے آگے بڑھ کر فی الفور قبول کر لیں۔ جیسے ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت کا بھی مطالعہ کیا تھا:

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا﴾

"اے ہمارے رب! ہم نے سنا ایک پکارنے والے کی پکار کو کہ دعوت دے رہا ہے ایمان کی کہ ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر' پس ہم ایمان لے آئے"۔

گویا یہ ہے وہ نورِ ایمان جس کے اجزائے ترکیبی دو ہیں' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ "نور پر نور" ـــــ دو انوار سے مرکب ہو کر وہ نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس سے اولاً انسان کا قلب منور ہوتا ہے اور ایک روشن چراغ کی صورت اختیار کر لیتا ہے' پھر وہ طاق منور ہوتا ہے یعنی پورا سینہ روشن ہو جاتا ہے جس کی جانب اشارہ ہے ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ﴾ کے الفاظ مبارکہ میں' پھر ان انوار سے انسان کا پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے اور ایسے انسان کا وجود اپنی ذات میں خلقِ خدا کے لئے نورِ ہدایت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسی عمل کا بدرجۂ تمام و کمال ظہور ہوا ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کہ وہ مجسم نورِ ہدایت اور قرآن مجید کے الفاظ میں "سِرَاجًا مُّنِیْرًا" بن گئے۔

خلاصۂ کلام یہ واضح ہوا کہ ایمان درحقیقت ایک نور ہے جو دو انور سے مرکب ہے' ایک نورِ فطرت اور دوسرے نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو "نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ" وجود میں آتا ہے اس کا محل و مقام ہے قلب انسانی ـــــ اور ظاہر بات ہے کہ جب انسان کا باطن اس نورِ ایمان سے منور ہو جائے گا تو اس کے آثار و نتائج ظاہر ہوں گے انسان کے رویّے اور طرزِ عمل میں' اس کے اخلاق و کردار میں اور اس کی دلچسپیوں' امنگوں اور مشاغل میں ـــــ چنانچہ اس درس کی اگلی دو آیات (نمبر ۳۶' ۳۷) میں نورِ ایمان کے ان ہی آثار و مظاہر کا بیان ہے۔

ایمانِ حقیقی کے عملی مظاہر

ایمانِ حقیقی کے ان عملی مظاہر کا ایک رخ وہ ہے جس کی ایک جھلک درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۹۵ میں دکھائی جا چکی ہے' یعنی ایثار و قربانی' صبر و مصابرت' ثبات و استقلال' ہجرت و شہادت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ ـــــ اور دوسرا رخ وہ ہے جو سورۃ النور کی آیات ۳۶ تا ۳۸ میں سامنے آتا ہے اور ذکر و مناجات' تضرع و اخبات' خوف و خشیت اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"(نور ایمان کی جلوہ گاہیں) ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ ان میں ایسے جوانمرد صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی اللہ کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں کوئی کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کر پاتی۔ (اور اس سب کے باوجود) وہ ایک ایسے دن (کے تصور) سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گے ـــــ نتیجتاً اللہ انہیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا اور انہیں اپنے فضل سے مزید نوازے گا ـــــ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے!"

ان آیات میں پہلی بات تو یہ سامنے آئی کہ اس روئے ارضی پر خارجی اعتبار سے اس نورِ ایمانی کے سب سے بڑے مراکز مسجدیں ہیں۔ یہ اللہ کے وہ گھر ہیں جن میں اہلِ

ایمان ہر روز پانچ مرتبہ جمع ہوتے ہیں۔ نورِ ایمان کا یہ ارتکاز ان گھروں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے' یعنی ان کا ادب اور تعظیم کی جائے اور اس میں اس کا نام لیا جائے' یعنی اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ آیت کے اس حصے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ایک بہت ہی عمدہ اور پیارا قول ہمیں ملتا ہے' وہ فرماتے ہیں : "المَساجدُ بیوتُ اللّٰہِ فی الارضِ' وھی تضیئُ لاھلِ السماءِ کما تضیئُ النّجومُ لاھلِ الارضِ" یعنی "مسجدیں زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور وہ آسمان والوں کو اسی طرح چمکتی نظر آتی ہیں جیسے زمین والوں کو ستارے چمکتے نظر آتے ہیں" ـــــ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نورِ ایمان کے' جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا تھا' سب سے بڑے مراکز اللہ کے یہ گھر ہیں' اور جن لوگوں کے دلوں میں وہ نورِ ایمان پیدا ہو جاتا ہے بلاشبہ ان کے قلبی اطمینان اور دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرکز یہ مسجدیں ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات قسم کے اشخاص وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ حشر کے میدان میں خاص اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا' جبکہ کسی کو بھی کہیں سایہ میسر نہیں ہو گا۔ ان میں ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہوں گے جن کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا : "ورجلٌ قلبُہٗ معلّقٌ بالمَساجدِ" یعنی "وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے"۔ وہ مسجد سے مجبوراً باہر نکلتا ہے کیونکہ اس کے گھر بار کی مصروفیات بھی ہیں' کاروبار کی ضروریات بھی ہیں اور دیگر حوائج ضروریہ بھی ہیں' لیکن مسجد کے باہر اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال لیا گیا ہو۔ گویا وہ ایک ضرورت اور مجبوری کے تحت مسجد سے نکلتا ہے ورنہ اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے اور وہ منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی پھر اذان کی آواز آئے وہ فوراً لپک کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائے۔

یہاں مساجد کو بلند کرنے کا جو حکم آیا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ مساجد کو بلند کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کا مفہوم مجرد تعمیر کرنا ہے۔ تعمیر کے لئے بھی کنایتاً لفظ "رفع" قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے' جیسے سورۃ البقرۃ میں آیا ہے :

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ﴾

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اور ان کے ساتھ اسمٰعیل بھی"۔

ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مساجد کی تعظیم و احترام ہے' یعنی مسجد کو ہر نوع کی گندگی اور نجاست سے بھی پاک صاف رکھنا اور ہر قسم کے لغو کاموں اور لغو گفتگو سے بھی محفوظ رکھنا۔ یہ تو ہے ظاہری تعظیم و احترام جیسا کہ بیت الحرام کے متعلق اسی سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴾

"اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں گے طواف کرنے والوں کے لئے اور اعتکاف کرنے والوں کے لئے اور وہاں رکوع و سجود (نماز) کے لئے آنے والوں کے لئے"

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مسجدیں نجاست معنوی یعنی شرک اور بدعت سے بھی پاک ہوں۔ بفحوائے الفاظ قرآنی :

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا﴾

"اور مساجد صرف اللہ ہی کے لئے ہیں' پس اس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو"

مزید برآں الفاظ کے ظاہر سے یہ بھی متبادر اور مترشح ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر بلند رکھی جائے تاکہ وہ دور سے نظر آئے' اسے بستی میں نمایاں مقام حاصل ہو اور وہ اس بستی کا مرکز معلوم ہو۔ عربی بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اس کے اکثر الفاظ معنی و مفاہیم کا گنجینہ ہوتے ہیں' لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ یہاں "تُرْفَعَ" میں یہ تینوں مفاہیم شامل ہیں۔

آگے چلئے' ابھی اس آیہ کریمہ کے پہلے حصہ پر ہی تدبر ہو رہا ہے :

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ﴾

"ان گھروں میں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے"

یہاں ہمارے دین کی ایک جامع اصطلاح "ذکر" کا بیان ہوا۔ اس اصطلاح میں ہر نوع کا

ذکر آ گیا۔ نماز خود ایک ذکر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے : ﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ "نماز قائم کرو میرے ذکر' میری یاد کے لئے" جبکہ سورۃ الحجر میں فرمایا :
﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝﴾ "یقیناً ہم نے اتارا ہے یہ "الذکر" (یعنی قرآن مجید) اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ اور نگہبان ہیں" ــــــ سورۂ ھود میں فرمایا :

﴿وَجَآءَکَ فِیۡ ھٰذِہِ الۡحَقُّ وَمَوۡعِظَۃٌ وَّذِکۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝﴾

"اور آیا (اے نبیؐ) آپ کے پاس اس (قرآن) میں بلاشبہ الحق اور نصیحت اور یاد دہانی اہل ایمان کے لئے"۔

گویا خود قرآن حکیم ذکر کامل بھی ہے اور ذکرِ مجسم بھی۔ ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَا اجۡتَمع قومٌ فِی بیتٍ مِن بُیوتِ اللّٰہِ یَتلُون کتابَ اللّٰہِ ویَتدارَسونَہٗ بینھم اِلّا نزلت عَلیھم السّکینۃُ وَغشیتْھُم الرحمۃُ وحفّتھُم الملائکۃُ وذکرھُم اللّٰہُ فیمن عِنۡدَہٗ))

"جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں اس کی کتاب کے درس و تدریس اور افہام و تفہیم کے لئے تو ان پر سکینت کا نزول ہوتا ہے' رحمت الٰہی ان کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے' فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ملا اعلیٰ یعنی ملائکہ المقربین کی محفل میں ذکر فرماتا ہے (کہ اس وقت میرے کچھ بندے میرے گھر میں صرف میری کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جمع ہوئے ہیں"۔

آگے چلئے' ان گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے بلند کرنے اور اپنے نام کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے' ان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے : ﴿یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡھَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ﴾ "ان گھروں میں صبح کے وقت اور شام کے اوقات میں اس کی تسبیح کرتے ہیں"۔

یہاں صبح کے وقت کے لئے لفظ "غُدُوّ" آیا ہے۔ "غُدُوّ" مصدر ہے اس کی جمع نہیں ہوتی' قرآن مجید میں یہ لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے۔ آصَال' اَصِیل کی جمع الجمع ہے'

"اَصِیل" کی جمع "اُصُل" اور اس کی جمع "آصَال" ہے۔ ان دو الفاظ "غُدُوّ" اور آصَال میں اشارہ ہے اس طرف کہ صبح کے وقت تو فرض نماز ایک ہی ہے' لیکن شام کے اوقات میں یعنی سورج کے ڈھلنے کے بعد سے رات کے تاریک ہونے تک چار فرض نمازیں ہیں' جن کا سلسلہ ظہر کی نماز سے شروع ہو کر عشاء کی نماز پر ختم ہوتا ہے۔ اسی کی طرف سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت مبارکہ میں اشارہ ہے :

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ﴾

"سورج کے ڈھلنے کے بعد سے لے کر نماز کو قائم رکھو رات کے تاریک ہونے تک"۔

اس میں ظہر سے عشاء تک کی چار فرض نمازیں آگئیں' اور "قُرآنَ الفَجرِ" سے مراد صلوٰۃ الفجر ہے' اس طرح پانچ فرض نمازوں کا ذکر ہو گیا۔

دنیوی مصروفیات میں اہل ایمان کا طرز عمل

اب آگے چلئے ـــــ یہ کن لوگوں کا ذکر ہے؟ اور ان تسبیح و تحمید میں مشغول لوگوں کی اصل شان کیا ہے؟ فرمایا :

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ﴾

"وہ (جواں ہمت) لوگ جنہیں غافل نہیں کر سکتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے"۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہاں "رِجَال" سے مراد صرف مرد ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں خواتین بھی شامل ہیں اور یہاں یہ لفظ کنایہ کے طور پر آیا ہے' اور اس سے مراد ہیں باہمت مرد و زن۔ اس لئے کہ اس دنیا میں ایک بندۂ مومن کے لئے نامعلوم کتنے دباؤ' کتنے موانع' کتنی تحریضات اور کتنی ترغیبات ہیں جن سے اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے' اور اگر وہ اللہ کے ساتھ لو لگائے رکھنا چاہتا ہے تو اسے نہایت شدید اور چومکھی کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے۔ لہٰذا اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونے کے لئے بڑی مضبوط قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ ورنہ کہیں تجارت انسان کو غافل کر دے گی اور کہیں کوئی نفع بخش سودا اپنے اندر "گم" کر

لے گا۔ اس لفظ گُم سے بے اختیار ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

ایک خدا ناآشنا انسان دنیوی مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں گم ہو جاتا ہے' جبکہ جن لوگوں کا قلب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے منور ہو جاتا ہے اور وہ اللہ پر حقیقتاً اور واقعتاً ایمان لے آتے ہیں تو ان کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے : (ترجمہ) ان باہمت لوگوں کو غافل نہیں کر پاتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید و فروخت اللہ کی یاد سے"۔ یہاں "تجارت" عام ہے اور "بیع" خاص ہے۔ یہ عطف الخاص علی العام کی ایک مثال ہے۔ ویسے بھی بیع میں فوری طور پر کوئی منفعت پیش نظر ہوتی ہے جبکہ تجارت ایک وسیع تر اصطلاح ہے اور اس کا سلسلہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس میں غیر محسوس طور پر اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مضمون کی مناسبت سے تجارت پر بیع کا عطف کیا گیا ہے' اس لئے کہ جب کوئی سودا ہو رہا ہوتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اس سودے میں مجھے فوری طور پر کتنا نفع حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لہٰذا یہ وسوسہ دل میں پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ اگر اذان کی آواز آ گئی ہے تو کیا ہوا؟ ذرا یہ سودا پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو مسجد کی جانب روانہ ہو جاؤں گا اور اگر جماعت چلی بھی جائے تو میں علیحدہ نماز پڑھ لوں گا' لیکن اس وقت یہ سودا چھوڑنا گھاٹے کا معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن ان باہمت لوگوں کا جن کے قلوب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے روشن ہوتے ہیں حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر پاتی۔ اس موقع پر سورۃ المنافقون کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں لائیے جس میں فرمایا گیا کہ :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ﴾

"اے اہل ایمان! تمہیں تمہارا مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں اور جو کوئی یہ طرز عمل اختیار کرے گا یقیناً وہی خسارے میں رہنے والے

ہیں"۔

اگر ان میں منہمک اور مشغول ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے تو جان لو کہ یہ بڑے خسارے کا سودا ہے۔ ان باہمت لوگوں کو کوئی تجارت اور خرید و فروخت نہ ذکر الٰہی سے غافل کر سکتی ہے' نہ ہی نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔ گویا نہ انسان دنیوی مصروفیات میں اتنا گم ہو جائے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام نہ رہے اور نہ مال کی محبت اس پر اتنی غالب آ جائے کہ زکوٰۃ ادا کرنی بھی دوبھر نظر آنے لگے۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ تو اصلاً قلب و نفس پر سے مال کی محبت کی گرہ کھولنے کا ذریعہ ہے۔ ورنہ تزکیۂ نفس کے لئے تو نہ صرف یہ کہ ہر سال نصاب کے مطابق زکوٰۃ دینی لازم ہے بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ابنائے نوع کی حاجت روائی اور مشکلات رفع کرنے کے لئے صدقاتِ نافلہ کا اہتمام لازم ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : ((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّ سِوَی الزَّکٰوۃِ)) "بلاشبہ تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مستحقین کا حق ہے"۔ اور بطورِ استشہاد آپؐ نے آیت بر کا حوالہ دیا (سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۷)' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں یعنی :

﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ' وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ﴾

"اور (حقیقی نیکی اس کی ہے) جس نے دیا مال اس کی محبت کے علی الرغم قرابت داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سائلوں کو اور گردن چھڑانے میں اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔"

آگے فرمایا کہ مساجد سے اتنی محبت اور ذکر و شغل کے دوام اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے التزام کے باوصف ان باہمت لوگوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ ان میں اپنی دینداری کا کوئی تکبر' کوئی عُجب' کوئی پندار اور کوئی گھمنڈ پیدا ہو جائے' بلکہ ان تمام حسنات اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ "یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ○" یعنی وہ لرزہ براندام رہتے ہیں' کانپتے رہتے ہیں' لرزاں و

ترساں رہتے ہیں اس دن کے خیال سے جس کی ہولناکی کا عالم یہ ہے کہ اس دن دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ یہ کنایہ اور استعارہ ہے قیامت کی ہیبت اور اس کے شدائد و مصائب کے لئے۔ وہ دن جس کے لئے سورۃ المزمل میں فرمایا : ﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا﴾ "وہ دن کہ جو بچوں کو بوڑھا کردے گا"۔ یہ باہمت لوگ اللہ سے لو لگانے اور ہر دم اس کی یاد کا التزام کرنے کے باوجود اس دن کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس دن ہر ابن آدم عدالت خداوندی میں محاسبہ کے لئے کھڑا ہو گا۔

آگے فرمایا : ﴿لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ "تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے ان کے بہترین اعمال کی"۔ یہاں ابتدا میں جو حرف جار یعنی "لام" آیا ہے اسے لام عاقبت کہا جاتا ہے۔ گویا کہنا یہ مقصود ہے کہ اصحاب ایمان و یقین کی ان کیفیات کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا دے گا۔ قرآن حکیم کے اکثر مترجمین نے "اَحْسَن" کی نسبت "جَزاء" سے قائم کی ہے' یعنی اللہ انہیں ان کے اعمال کی بہت عمدہ' اعلیٰ اور احسن جزا دے گا۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ "اَحْسَن" کا تعلق "مَا عَمِلُوْا" سے ہے' اس لئے کہ قرآن حکیم کے بعض دوسرے مقامات پر (جیسے سورۃ النحل کی آیات ۹۶ اور ۹۷) اعمالِ صالحہ کی اخروی جزا کے ذکر میں "اَحْسَن" کے ساتھ حرف جار "بِ" بھی آیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اہل جنت کے اجر کا فیصلہ اور ان کے مرتبہ و مقام کا تعین ان کے بہترین اعمال کی مناسبت سے کرے گا' اس لئے کہ اچھے سے اچھے انسان کے بھی تمام اعمال برابر اور مساوی قدر و قیمت کے حامل نہیں ہوتے، ان میں کچھ نہ کچھ فرق و تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ہر انسان سے کچھ نہ کچھ کوتاہیاں اور خطائیں بھی ضرور سرزد ہو جاتی ہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ "الانسانُ مرکبٌ من الخطأ والنسیان" یعنی انسان دو چیزوں کا پتلا ہے' اس سے غلطی کا ارتکاب اور خطا صدور بھی ہو جاتا ہے اور بھول چوک تو اس کی جبلت اور خمیر ہی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعمال میں سے جو بہترین اور چوٹی کے اعمال ہوں گے ان کے اعتبار سے حساب لگایا جائے گا اور ان کی جزا ان کے اعلیٰ ترین اعمال کی مناسبت سے مترتب ہو گی۔ کم تر درجے کے اعمال نظر

انداز کر دیئے جائیں گے اور جو کوتاہیاں اور خطائیں ہوں گی انہیں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ غفّاری و رحیمی سے ان کے نامہ اعمال میں سے حذف کر دے گا۔ گویا انہیں اپنی شانِ ستّاری سے ڈھانپ لے گا۔ جیسا کہ ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعے کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ "میں لازماً ان کی برائیوں کو ان سے دور کر دوں گا"۔ جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حیاتِ دنیوی کے دوران ان کے دامن کردار کے داغ دھبے دھودے گا اور ان کے نفوس کا تزکیہ فرمادے گا۔ اور یہ بھی کہ آخرت میں ان کے نامہ اعمال کی سیاہی کو دھودے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ : ﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ "اور میں لازماً ان کو ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی"۔ یا جیسے سورۂ ھود میں یہ اصول بیان فرمایا : ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ "یقیناً بھلائیاں برائیوں کو محو کر دیتی ہیں"۔ لہٰذا ان باہمت لوگوں کا آخرت میں جو مقام اور مرتبہ معین ہو گا وہ ان کے اعلیٰ اور احسن اعمال کی نسبت و مناسبت اور اعتبار سے ہو گا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جیسے دنیا میں اُجرت محنت و مشقت کی نسبت سے ملتی ہے اسی طرح آخرت میں اجر اور جزا کا معاملہ تو اعمال صالحہ کی مناسبت سے ہی ہو گا خواہ اعلیٰ ترین اعمال ہی کی مناسبت سے ہو۔ اس پر مزید ہے وہ فضل جو اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے عنایت فرمائے گا۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ "اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے مزید عطا فرمائے گا"۔ واضح رہے کہ یہ فضل کسی محنت کا صلہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی دین ہے' لہٰذا یہ کسی حساب کتاب کی پابند نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی شان جود و سخا کا ظہور ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ "اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے بلا حد و حساب"۔ گویا اس کا فضل بلا نہایت ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہے۔

اس مقام پر تھوڑا سا توقف فرما کر آج کے سبق کو گزشتہ سبق سے ملا کر ایک حقیقی بندۂ مومن یا بقول اقبال "مردِ مومن" کی شخصیت کا مکمل نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجئے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہمارا درس ششم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات پر

مشتمل تھا۔ اس میں بھی ایمان کی ترکیب بیان ہوئی تھی کہ ایمان باللہ 'ایمان بالآخرۃ اور پھر ایمان بالرسالت کیسے وجود میں آتا ہے! اس کے بعد ایک جامع آیت میں بندۂ مومن کی سیرت و کردار کی تصویر کے ایک رخ کی حیثیت سے سامنے لایا گیا تھا وہ نقشہ جس کے خدوخال تھے سعی وجہد 'ایثار و قربانی' جہاد و قتال اور صبر و مصابرت۔ چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ الفاظ تھے :

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾

"جن لوگوں نے میرے لئے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں (تکلیفیں دی گئیں) اور جنہوں نے میرے لئے جہاد و قتال کیا اور اپنی جانیں قربان کر دیں"۔

یہ ہے بندۂ مومن کی سیرت و کردار کی تصویر کا ایک رخ یعنی جِدّ و جُہد 'کوشش و محنت' کشمکش و تصادم 'صبر و ثبات 'ایثار و قربانی' جہاد و قتال حتیٰ کہ جان کا نذرانہ پیش کر دینا۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ مساجد کے ساتھ ایک قلبی انس' ذکرِ الٰہی کے دوام اور ان کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے اور اس میں ذوق و شوق 'ذکر و شغل اور انابت و اطاعت پر سونے پر سہاگے کی مثال ہے خوف اور خشیتِ الٰہی' جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں اور تصویر کا صحیح تصور ان دونوں رخوں ہی سے مکمل ہوتا ہے 'اسی طرح اگر بندۂ مومن کی شخصیت کا بھی صرف ایک رخ سامنے رہے گا تو شخصیت بھی یک رخی رہے گی۔ چنانچہ اسی کے مظاہر آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں! اصل میں ایک مردِ مومن یا انسانِ مطلوب کی شخصیت کے یہ دونوں رخ مطلوب ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک بندۂ مومن کی شخصیت میں یہ دونوں رخ بیک وقت موجود ہوں۔ چنانچہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں یہ دونوں رنگ بتمام و کمال اور بیک وقت نظر آتے ہیں اور اس کی گواہی دشمنوں تک نے دی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ "اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ" یعنی "اصل فضیلت وہی

ہے جس کی گواہی دشمن دیں"۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں جب سلطنتِ کسریٰ سے مسلح تصادم ہوا تو ایرانی افواج کے جاسوسوں اور مخبروں نے مسلمان افواج کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر اپنے سپہ سالار کو جو رپورٹ دی تھی اس کے یہ الفاظ نہایت قابل غور ہیں اور ان کی ذہانت و فطانت پر دلالت کرتے ہیں کہ "هُمْ رُهبانٌ بِاللَّیلِ وَفُرسانٌ بِالنَّهارِ" یعنی یہ عجیب لوگ ہیں' دن میں یہ شہسواروں کے روپ میں نظر آتے ہیں اور میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہیں اور رات کے وقت یہی لوگ راہب بن جاتے ہیں اور مصلوں پر کھڑے نظر آتے ہیں اور ان کے آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہیں تر ہو جاتی ہیں اور اسی طرح اپنے رب کے حضور الحاح و زاری میں اپنی راتوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے ہیں۔

پس ایک بندۂ مومن کی مکمل شخصیت "هُم رهبانٌ بِاللَّیلِ وَفُرسانٌ بِالنَّهارِ" کے امتزاج ہی سے وجود میں آتی ہے۔ ہمارے سامنے "فُرسانٌ بِالنَّهارِ" والا رخ گزشتہ سبق میں آیا تھا اور "رُهبانٌ بِاللَّیلِ" کی صحیح تعبیر آج کے سبق میں سامنے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ادنیٰ درجے میں ہی سہی ان اوصاف کا جامع مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے جو ان دو اسباق میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آمین یا ربّ العالمین۔

ظلمتِ کفر کے دو درجے

اب ہم اس رکوع کی آخری دو آیات مبارکہ پر کسی قدر غور و تدبر کرنے کی کوشش کریں گے۔ آیئے پہلے ان آیات کا ایک سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کرلیں :

﴿ وَالَّذِينَ كَفَرُوٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۚ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۚ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۚ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۚ وَمَنْ لَّمْ

یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب (یعنی دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت) جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی۔ البتہ اللہ کو اس کے پاس موجود پاتا ہے جو اس کا حساب چکا دیتا ہے' اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یا ان اندھیروں کے مانند جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج اور اس پر سایہ کئے ہوں بادل۔ گویا تاریکیاں ہیں تہ بر تہ۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہ فرمائے اس کے لئے کوئی روشنی نہیں!"

ترجمے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان آیات میں کفر کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے دو تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جو عربی کے ایک مقولے میں سامنے آتا ہے کہ تُعرفُ الاشیاءُ بِاَضدادِھا "اشیاء کی صحیح معرفت ان کے اضداد کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے"۔ یعنی کسی شے کی حقیقت کو ایک تو آپ خود اس شے پر غور و فکر کر کے سمجھ سکتے ہیں اور دوسرے اس طور سے کہ اس چیز کی ضد پر غور کیا جائے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے' تو اس سے بھی اس شے کی حقیقت پر روشنی پڑے گی اور وہ منقح اور واضح ہو کر شعور و ادراک کی گرفت میں آجائے گی۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ دن کی اصل حقیقت رات کے پس منظر میں خوب نمایاں ہوتی ہے۔ اور روشنی کی حقیقت تاریکی کے تقابل میں زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے ایک طرف تو سورۃ النور کی آیت نمبر ۳۵ میں نہایت فصیح و بلیغ تمثیل سامنے آچکی ہے جس میں ایمان کو ایک نور سے تشبیہ دی گئی جو مرکب ہے دو انوار سے۔ ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس کا محل و مقام ہے قلبِ انسانی۔

اس کے بعد آیات ۳۶ تا ۳۸ میں ایمان کے اس نورِ باطنی کے انسانی شخصیت میں ظہور کی دو صورتوں میں سے ایک کو نہایت فصیح اور بلیغ الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ اسی حقیقتِ ایمان کو مزید اجاگر کرنے کے لئے آیات ۳۹' ۴۰ میں ایمان حقیقی کے نور سے محروم

انسانوں کی شخصیت کی جھلک دو تمثیلوں کے پیرائے میں دکھادی گئی۔ مجرد الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان تمثیلوں میں سے پہلی تمثیل میں کچھ روشنی اور تاریکی کے بین بین کی سی کیفیت سامنے آتی ہے' جبکہ دوسری تمثیل میں تاریکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم دقتِ نگاہ سے مشاہدہ کیا جائے تو ان ظاہری الفاظ کے پردوں میں ہدایت و حکمت کے نہایت قیمتی موتی چھپے ہوئے ہیں۔

ان تمثیلوں پر غور کرنے سے قبل ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ جیسے ایمان کی تمثیل میں بھی قانونی نہیں حقیقی ایمان کی ماہیت بیان کی گئی ہے اسی طرح یہاں کفر سے مراد قانونی اور ظاہری کفر نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی کفر ہے۔ مبادا ہم یہ گمان کرلیں کہ یہاں صرف غیر مسلموں اور کھلے کافروں کے متعلق بات ہو رہی ہے اور ہم مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ گمان اور مغالطہ لاحق ہو گیا تو ان آیاتِ مبارکہ میں قرآن حکیم کی جو ہدایت اور رہنمائی ہے' اس سے ہم محروم رہ جائیں گے۔ واضح رہے کہ جس طرح قانونی ایمان کا تعلق صرف "قول" سے ہے اور اس کی اساس شہادت پر ہے' یعنی "اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" اور حقیقی ایمان کا تعلق تصدیقٌ بالقلب سے ہے اور وہ عبارت ہے یقینِ قلبی سے' اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں اور دو درجے ہیں۔ ایک کفر قانونی اور ظاہری ہے یعنی کھلم کھلا انکار اور ایک کفر باطنی اور مخفی ہے' یعنی ظاہر میں تو اقرار ہے لیکن باطن میں انکار چھپا ہوا ہے' چنانچہ قول کے مطابق عمل موجود نہیں ہے۔ اس کفرِ حقیقی کے بارے میں ہمارے ایک درویش جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے' بڑے کیف کے عالم میں کہا کرتے تھے کہ "جو دم غافل' سو دم کافر" یعنی انسان کا جو وقت بھی غفلت میں بیتتا ہے وہ ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے' جیسے کہ گزشتہ صفحات میں علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کا حوالہ آیا تھا کہ ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

الغرض اگر کوئی مسلمان غفلت کے عالَم میں ہو' اللہ کو بھولے ہوئے ہو' اللہ سے محجوب ہو گیا ہو' پردے میں آگیا ہو تو یہ گمشدگی کی کیفیت ہے جو ایک نوع کا کفر ہے' اگرچہ

اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ مزید برآں' کفر کے ایک معنی ناشکرا پن بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں وہی مراد ہو۔ بہرحال یہاں کفر کے لئے جو تمثیلیں بیان ہو رہی ہیں' وہ کفرِ حقیقی اور کفرِ معنوی کی ہیں' صرف کفرِ قانونی یا کفرِ فقہی کی نہیں۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جس میں انسان کا قلب ایمان کے حقیقی نور اور حقیقی روشنی سے محروم ہو' قطع نظر اس سے کہ ظاہری اور قانونی طور پر وہ مسلمان ہو یا کھلم کھلا بھی کفر ہی کا اظہار کر رہا ہو۔

دوسری تمثیل۔ ایمانِ حقیقی سے محروم لوگوں کا انجام

اب اس کفرِ حقیقی و معنوی کی بھی دو کیفیات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص ایمانِ حقیقی کے لوازم یعنی اللہ کی ہستی اور توحید کے یقین اور اس کے ساتھ خلوص و اخلاص کے تعلق اور آخرت کے یقین اور اخروی فلاح کے حصول کے جذبے سے تو قطعاً محروم ہو لیکن کسی دوسرے جذبے یا سبب سے کوئی نیکی' کوئی بھلائی اور کسی نہ کسی نوع کا رفاہ عام اور خدمتِ خلق کا کام کر رہا ہو' جیسے کسی نے کوئی یتیم خانہ کھلوا دیا ہو یا کوئی کنواں کھدوا دیا ہو یا کوئی شفاخانہ اور اسپتال بنوا دیا ہو' یا رفاہی مقاصد کے لئے کوئی فاؤنڈیشن قائم کر دی ہو یا کوئی خیراتی ادارہ قائم کر دیا ہو۔ اگر یہ سارے کام اللہ کی رضاجوئی اور آخرت کی فوز و فلاح کے حصول کے جذبے کے سوا کسی اور جذبہ محرکہ کے تحت صادر ہو رہے ہیں تو ان اعمال کی حقیقت پہلی تمثیل میں بیان ہوئی ہے' یعنی :

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے سراب جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔"

یہ ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل ہے' اس لئے کہ دنیا بھر میں یہ بات معروف و معلوم ہے کہ ایک لق و دق صحرا' ایک چٹیل میدان اور وسیع و عریض ریگستان میں ریت کا ایک حصہ اس طرح چمکتا ہے کہ دور سے دیکھنے والے کو وہ پانی نظر آتا ہے اور پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی صرف دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں "ظَمْاٰن" کا لفظ "فَعْلان" کے وزن پر آیا ہے۔ اسی وزن پر "رَحْمان" آتا ہے' یعنی وہ ہستی جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے

مانند ہو۔ چنانچہ "ظَمْاٰن" کے معنی ہوں گے وہ شخص جو پیاس سے مرا جا رہا ہو۔ اسے ریگستان میں دور سے پانی نظر آ رہا ہے اگرچہ وہ پانی نہیں ہے محض سراب ہے' لیکن وہ اسے پانی سمجھ کر جس طرح بھی ہو گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا وہاں پہنچتا ہے' لیکن وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ :

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا﴾

"یہاں تک کہ جب وہ اس (سراب) کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی"۔

اس کی حسرت کا اندازہ کیجئے کہ وہ گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا پانی کی امید میں وہاں پہنچتا ہے تو اس کو پانی نہیں ملتا جبکہ وہ وہاں موت کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ اور موت کیا ہے؟ وہ تو درحقیقت "شاہد رہ" ہے جس سے گزرنے کے بعد اسے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے' لہٰذا فرمایا :

﴿وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ﴾

"اور وہ وہاں اللہ کو موجود پاتا ہے' پس وہ اس کا حساب چکا دیتا ہے"۔

آیت کے اس پورے حصے کا جس کا ہم نے اب تک مطالعہ کیا ہے مطلب و مفہوم یہ ہے کہ ایسا شخص جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو گا تو اس کو تو گمان ہو گا کہ میں نے دنیا میں بڑے نیک کام کئے تھے' میں نے خیراتی ادارے قائم کئے تھے' میں نے فاؤنڈیشن قائم کئے تھے' میں نے یتیم خانے' شفاخانے اور اسپتال بنوائے تھے اور متعدد رفاہِ عام کے کام کئے تھے' میں نے ان اداروں کی بلامُزد اعزازی طور پر بے شمار خدمات انجام دی تھیں۔ لہٰذا اسے ان اعمال پر بہت کچھ تکیہ ہو گا' ان کا سہارا ہو گا' لیکن جیسے ریگستان میں دور سے چمکتی ہوئی ریت پیاسے کو پانی نظر آتی ہے حالانکہ وہ سراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا' ایسے ہی جب ایسا شخص عدالت خداوندی میں محاسبہ کے لئے کھڑا ہو گا تو اسے معلوم ہو گا کہ چونکہ ان اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی بلکہ وہ نورِ ایمان سے خالی اور محض ریاکاری کے جذبے کے تحت شہرت اور ناموری کے حصول کے لئے یا کسی دنیوی منفعت اور مصلحت کے تحت یعنی انکم ٹیکس بچانے کے لئے یا الیکشن میں ووٹ لینے کے لئے یا سرکار دربار میں رسائی و پذیرائی کے لئے کئے گئے تھے' لہٰذا ان کی آخرت میں کوئی وقعت نہیں ہو گی بلکہ وہاں ان کی حیثیت کھوٹے سکوں کی ہو گی۔ گویا یہ تمام اعمال وہاں سراب ثابت

ہوں گے' جیسے دور سے چمکتی ہوئی ریت پانی نظر آتی ہے جبکہ حقیقت میں پانی موجود نہیں ہوتا۔ ویسے ہی ان کے یہ اعمال جو ظاہری صورت کے اعتبار سے نیکی اور خیر کے اعمال نظر آتے ہیں' آخرت میں لاحاصل اور بے نتیجہ رہیں گے اور اللہ ان کا حساب چکادے گا۔ اور اس کی شان یہ ہے کہ

﴿وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۝﴾

"اور اللہ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی"۔

واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام "الحسیب" بھی ہے۔ وہ قیامت کے دن ہر انسان کی دنیوی زندگی کے تمام اعمال ہی نہیں بلکہ اس کی نیتوں' اس کے ارادوں اور اس کے محرکاتِ عمل کا پورا حساب لے گا۔ اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ کو کسی جمع تفریق کی ضرورت نہیں ہوگی جو ہمیں ہوتی ہے۔ اس کے کمپیوٹرز کا کوئی تصور نسان کر ہی نہیں سکتا۔ سورۃ الکہف میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب اعمال نامہ سامنے آئے گا تو مجرم لرز اٹھیں گے اور کہیں گے :

﴿یٰوَیْلَتَنَا مَالِ ھٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً اِلَّآ اَحْصٰھَا﴾

"ہائے ہماری شامت! یہ اعمال نامہ کیسا ہے کہ اس نے کسی بڑی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہی نہیں کہ جس کا احاطہ نہ کرلیا ہو"۔

اس میں تو باریک ترین تفصیلات کو بھی نہیں چھوڑا گیا' چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی اس میں موجود ہے اور بڑی سے بڑی بات کا بھی یہ احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہی بات سورۃ الزلزال میں فرمائی گئی :

﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۝﴾

"جو کوئی ذرے کے ہم وزن نیکی کرے گا اپنے سامنے موجود پائے گا اور جو کوئی ذرے کے ہم وزن بدی کمائے گا تو اسے بھی دیکھ لے گا"

یاد ہوگا کہ اس سلسلۂ دروس کے درس دوم یعنی آیۂ بر میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقی نیکی کیا ہے!

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ﴾

"بلکہ حقیقی نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یوم آخر پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور نبیوں پر۔"

گویا کوئی عمل جس کی بنیاد میں ایمان نہیں ہے حقیقتاً نیکی نہیں ہے چاہے بظاہر وہ نیکی کا کتنا ہی بڑا عمل نظر آتا ہو' حتیٰ کہ نماز' روزہ اور صدقہ و خیرات تک کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر ان کا مقصد ریاکاری ہو اور یہ کام شہرت کے حصول یا لوگوں پر اپنی دین داری کی دھونس جمانے کے لئے کئے جائیں تو عین شرک قرار پائیں گے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے :

((مَن صَلّٰى يُرائِي فقد اَشْرَكَ' وَمن صام يُرائي فقد اَشْرَكَ' ومن تصدَّقَ يرائي فقد اَشْرَكَ))

"جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لئے اس نے شرک کیا' اور جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لئے اس نے شرک کیا' اور جس نے صدقہ و خیرات کیا دکھاوے کے لئے اس نے بھی شرک کیا"۔

یعنی اگر اعمال کی بنیاد ایمانِ حقیقی پر ہے اور وہ خالصتاً اللہ کی رضاجوئی اور آخرت کی جزا طلبی کے جذبے کے تحت صادر ہو رہے ہیں تب تو وہ واقعتاً نیکی قرار پائیں گے اور موجبِ اجر و ثواب ہوں گے' بصورتِ دیگر ان کی حیثیت محض سراب کی سی ہے!

قرآن مجید میں دو اور مقامات پر بھی یہ مضمون دو نہایت حسین و جمیل تمثیلوں کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ ایک تو سورۃ النور کے فوراً بعد سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۝﴾

"(جنہیں یہ لوگ بڑے بڑے عمل سمجھ رہے ہیں اور جن پر انہوں نے تکیہ کیا ہوا ہے) ہم قیامت کے دن ان کے ان اعمال کی طرف بڑھیں گے اور انہیں ہوا میں اڑا دیں گے۔"

بلا تشبیہ نقشہ بالکل وہی ہو گا جیسے ٹھوکر مار کر کسی چیز کو مشتِ غبار کی صورت ہوا میں اڑا دیا

جاتا ہے' اس لئے کہ ان کے اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی اور وہ خالصتاً اللہ کے لئے نہیں کئے گئے تھے۔ دوسری تشبیہ سورۂ ابراہیم میں وارد ہوئی ہے۔

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ﴾

"جن لوگوں کو اپنے رب پر ایمان میسر نہیں ہے' ان کی نیکیاں اور ان کے اعمال اس راکھ کے مانند ہیں جسے کسی جھکڑ والے دن تیز ہوا اڑا کر لے جائے۔"

گویا ان کے لئے نہ کوئی جماؤ اور ٹھہراؤ ہے اور نہ ثبات و دوام۔ آگے ارشاد ہوتا ہے :

﴿ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝ ﴾

"جسے وہ اپنی کمائی اور کسب سمجھ رہے ہوں گے اور اس پر اجر و ثواب کی امیدیں لگائے بیٹھے ہوں گے' اس میں سے ان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آ سکے گا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ہے بہت دور کی گمراہی اور سب سے بڑی محرومی و ناکامی۔"

الغرض کفر کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان حقیقی ایمان سے محرومی کے باعث خلوص و اخلاص سے تو تہی دست و تہی دامن ہو لیکن مضطرب ضمیر کے لئے جھوٹا اطمینان فراہم کرنے کی غرض سے یا شہرت و عزت کے حصول کی خاطر یا کسی دنیوی منفعت و مصلحت کے لئے نیکی کے کام سرانجام دے رہا ہو تو آیت زیر درس کی رو سے ایسی نیکیاں اور اس قسم کے اعمالِ خیر محض سراب کا درجہ رکھتے ہیں۔

اِس سراب کے دھوکے میں گرفتار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ حقائق سے محجوب ہوتے ہیں اور فکر و نظر کی سطح پر مختلف النوع تاریکیوں اور اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان تاریکیوں اور اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانا ان حضرات کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان سے بہرہ ور فرمایا ہو۔ جیسے سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول جناب محمد ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا :

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

"وہی ہے (اللہ) جو اپنے بندے (ﷺ) پر (قرآن مجید کی) روشن آیات نازل

فرمارہا ہے تاکہ وہ تمہیں (کفر و ناشکری کے) اندھیروں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لے آئے"۔

اب جن کی بھی آنکھیں کھل گئی ہوں اور جن کو بھی نورِ ایمان کی کوئی رمق میسر آگئی ہو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ابنائے نوع کو ایمانِ حقیقی کی دعوت دیں' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

﴿لا یُؤمنُ احدُ کم حتّٰی یحبَّ لاخیہِ ما یحبُّ لِنَفسہٖ﴾

"تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک (حقیقی) مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔

لہذا اگر ایمان حقیقی کی روشنی کسی کو میسر آگئی ہے تو اس کو عام کرنا اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے اور یہ کام اس پر واجب اور فرض ہے!

تیسری تمثیل۔ کفر کا آخری اور انتہائی درجہ

کفر کا دوسرا اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ایمان سے محرومی پر مستزاد ضمیر بھی بالکل مردہ ہو چکا ہو اور نیکی اور بدی کی تمیز بھی سرے سے مفقود ہو چکی ہو۔ چنانچہ اب انسان کی شخصیت و کردار میں سوائے عریاں نفس پرستی کے اور کچھ نہ رہے اور نیکی اور بھلائی ملمع کے درجہ میں بھی موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری تمثیل میں یہ انتہائی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ روشنی کی کوئی ایک کرن بھی موجود نہیں' بلکہ انتہائی تاریکی اور تہہ بر تہہ ظلمتیں ہیں۔ یعنی کامل خود غرضی ہے اور خواہشات و شہوات ہی کی پیروی ہے اور انسان ہوائے نفس ہی کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ کی نیکی اور دکھاوے کا خیر بھی موجود نہیں اور کوئی بھلائی خواہ وہ ملمع ہی کی نوعیت کی ہو اس کی بھی کوئی کرن سیرت و کردار میں نظر نہ آئے۔ یہ گویا ضلالت' گمراہی اور گراوٹ کی آخری انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کیفیت کو یوں تعبیر فرمایا گیا : ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ "تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں"۔ اس ظلمتِ مطلق اور تاریکیٔ محض کے لئے جو تمثیل یہاں دی گئی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی امیر البحر اسی کی بناء پر ایمان سے مشرف ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے زندگی بھر کبھی سمندری سفر نہیں کیا'

جبکہ اس تمثیل کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ تمثیل صرف وہی شخص دے سکتا ہے جس کی بیشتر زندگی سمندر کے سفر میں گزری ہو اور اسے گہرے سمندر میں اکثر طوفانوں سے سابقہ درپیش آیا ہو اور اسے ذاتی تجربہ ہو کہ سمندر کی گہرائی میں اندھیرے کی کیا کیفیت ہوتی ہے جبکہ موجوں پر موجیں چڑھی چلی آ رہی ہوں اور اوپر گہرے بادل بھی ہوں کہ ستاروں کی کوئی چمک بھی پانی میں منعکس نہ ہو رہی ہو۔ ایسی مکمل تاریکی کا کوئی تخیل و تصور کسی عام انسان کے لئے ممکن نہیں ہے' لہٰذا یہ تمثیل اور تشبیہ یا تو وہ شخص دے سکتا ہے جسے عملاً کسی اندھیری رات میں جبکہ گہرے بادل بھی چھائے ہوئے ہوں سمندر میں کسی طوفان سے سابقہ پیش آیا ہو اور پھر وہ قادر الکلام بھی ہو اور فصاحت و بلاغت سے بدرجۂ تمام و کمال بہرہ ور ہو! یا پھر ایسی تمثیل اور تشبیہ صرف اللہ ہی بیان کر سکتا ہے جو کل کائنات کا خالق و مدبّر ہے۔ لہٰذا انہوں نے تسلیم کیا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آئے۔

اب ذرا تمثیل کے الفاظ پر توجّہ مرکوز کیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا﴾

"یا جیسے وہ اندھیرے جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جسے ڈھانپے ہوئے ہو موج' پھر اس کے اوپر چڑھی آ رہی ہو ایک اور موج' اور (پھر مطلع بھی صاف نہ ہو بلکہ) اس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوں۔ گویا تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا"۔

گھُپ اندھیرے کے لئے ہماری زبان کا بھی محاورہ ہے "ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا"۔ اس لئے کہ ایک انسان جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے سمت کا شعور تو حاصل ہوتا ہے اور خوب اندازہ ہوتا ہے کہ میرا ہاتھ کدھر ہے' لیکن اگر وہ اس کے باوجود اپنے ہاتھ کو بھی دیکھ نہیں پا رہا تو معلوم ہوا کہ انتہائی تاریکی ہے اور روشنی کی کوئی رمق بھی موجود نہیں! سبحان اللہ و بحمدہٖ یہ ہے تمثیل کی معراج اور تشبیہ کا کمال!

اب اس آیتِ مبارکہ کے آخری حصہ پر توجہ فرمایئے۔ ارشاد فرمایا :

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ○﴾

"اور جس کو اللہ ہی نے نور عطانہ فرمایا ہو' اس کے لئے کوئی نور نہیں!"

نور تو اصل میں ایمان ہے' اگر ایمان میسر نہیں تو پھر نور کہاں؟ اس صورت میں تو تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں!!

اس درس کے آغاز میں عرض کیا گیا تھا کہ جیسے نورِ خارجی اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے ویسے ہی نورِ باطنی حقائق کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا نورِ ایمان نہ ہو تو حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اسی کو بصیرت یعنی باطنی مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ رہی ہماری ظاہری بصارت تو وہ حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ کسی عارف کامل نے کیا خوب کہا ہے ۔

دم چیست؟ پیامے است ! شنیدی نہ شنیدی ؟
در خاکِ تو یک جلوہٗ عام است نہ دیدی ؟
دیدن . دگر آموز! شنیدن دگر آموز!!

یعنی یہ سانس کی آمد ورفت کیا ہے؟ ایک پیغام ہے! تم سنتے ہو یا نہیں سنتے؟ اور تمہارا خاکی وجود ایک نور کی جلوہ گاہ بھی ہے! تم دیکھتے نہیں؟ تو تمہیں چاہئے کہ (حیوانی سمع وبصر سے بلند تر سطح پر) ایک دوسری ہی طرح کا دیکھنا بھی سیکھو اور سننا بھی! واقعہ یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کے بغیر انسان اس "دیدنِ دگر" اور "شنیدنِ دگر" سے محروم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ دعا تو بہت ہی مشہور ہے کہ ((اَللّٰهُمَّ اَرِنِی حَقِیقَةَ الاشیاءِ کَمَا هِیَ﴾ یعنی "اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الحقیقت ہیں!" علاوہ ازیں صحیح بخاری' صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں یہ دعا بھی منقول ہے جو آنحضور ﷺ خاص طور پر فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پڑھا کرتے تھے۔

((اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فی قلبی نُورًا وَفی بَصَری نورًا وَفی سَمعی نورًا وعَن یمینی نورًا وعَن یَساری نورًا وفَوقی نورًا وتَحتی نورًا وأَمامی نورًا وخَلفی نورًا وَاجْعَل لِی نورًا وَفِی لسانی نورًا وفی عصَبی نورًا ولَحمی نورًا ودَمی نورًا وشَعری نورًا

وبَشَرِی نُورًا وَاجْعَل فِی نَفْسِی نورًا وَعَظِّمْ لِی نورًا،اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِی نُورًا))

"اے اللہ! میرے دل میں نور عطا فرما' میری بصارت میں نور عطا فرما' میری سماعت میں نور عطا فرما' میری داہنی جانب سے نور دے اور میری باہنی جانب سے بھی نور عنایت کر' اور میرے اوپر سے نور دے اور میرے قدموں تلے سے نور دے' اور میرے سامنے سے نور دے اور میری پشت کے پیچھے سے نور دے اور میرے لئے نور ہی نور کر دے! اور میری زبان میں نور دے اور میرے رگ و پے میں نور بھر دے اور میرے گوشت میں نور بھر دے اور میرے خون میں نور بھر دے اور میرے بالوں میں نور بھر دے اور میری کھال میں نور دے' میری جان کو نور سے لبریز کر دے اور میرے نور کو فراخ و وسیع فرما دے اور مجھے نور ہی نور عطا کر!"

اس سبق کی پہلی آیت (نمبر ۳۵) میں ہم پڑھ چکے ہیں ﴿یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ﴾ "اللہ ہدایت بخشتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے" اور چونکہ ہدایت کے مفہوم میں رہنمائی یعنی راستہ دکھا دینے سے لیکر منزلِ مقصود تک بالفعل پہنچا دینے کے جملہ مراحل داخل ہیں لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ رسائی عطا فرما دیتا ہے اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ ولولہ' یہ امنگ اور یہ آرزو پیدا فرما دے کہ ہم بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہیں کفر و شرک' الحاد و زندقہ' مادہ پرستی اور ریاکاری اور منافقت اور قول و عمل کے تضاد کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و یقین کی روشنی میں آجانے کی توفیق مل گئی ہو! آمین یارب العالمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○○

انٹرنیٹ کی سہولت رکھنے والوں کے لئے E-mail اور Web page کا ایڈریس
E-mail : anjuman@brain.net.pk
URL. http://www.tanzeem.org

جہاد کا قرآنی تصوّر

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی ☆

اس بزم گاہ عالم میں مختلف قسم کے ادیان و مذاہب اور مختلف قسم کے افکار و خیالات پائے جاتے ہیں۔ اسلام اس لحاظ سے ان تمام میں نمایاں ہے کہ یہ کسی انسان کے ذہن و فکر کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ کسی مخصوص خطۂ ارض کے لئے ہے بلکہ یہ خالق کائنات کا عطا فرمودہ ضابطہ ہے اور ابتداء آفرینش سے لے کر قیامت تک پوری دنیائے انسانیت کے لئے ہے۔ یہی اسلام آدمؑ و حواؑ کا تھا' عیسیٰؑ و موسیٰؑ بھی اسی اسلام کے علمبردار تھے اور خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی نظام حیات کو لے کر آئے۔ گویا کہ اسلام ہی تمام انبیاء و رسل کا دین تھا۔ اس باب میں قرآن کا اعلان یہ ہے :

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ... ﴾ (الشوریٰ : ۱۳)

"اس نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمد ﷺ) ہم نے تمہاری طرف بذریعہ وحی بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں (اس تاکید کے ساتھ) کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ"۔

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز اس پہلو سے ہے کہ آپ پوری دنیائے انسانیت کے لئے تشریف لائے' اس لئے آپ کے ذریعہ جو اسلام آیا وہ بلا فرق و امتیاز پوری نسل انسانی کے لئے اور قیامت تک کے لئے آیا۔ چنانچہ اسلام انسانیت کو مکمل دولتِ عظمیٰ کی شکل میں رسول مقبول ﷺ کے توسط ہی سے ملا' جس کا اعلان اللہ تعالیٰ

☆ لیکچرر شعبہ دینیات' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

یوں فرماتا ہے :

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ﴾ (المائدہ : ۳)

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے طریقہ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا"۔

ایک اور جگہ اسلام کی آفاقیت اور صرف اسی کے خدائی طریقہ زندگی ہونے کی سند یوں بیان کی جاتی ہے :

﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ... ﴾ (آل عمران : ۱۹)

"بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

سورۂ آل عمران میں ہی آگے یوں فرمایا گیا :

﴿ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ' وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ○ ﴾ (آل عمران : ۸۵)

"جو بھی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین چاہے گا وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے ہمکنار نہیں ہو گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو گا"۔

پانی' مٹی' ہوا' غذا اور دیگر اسباب دنیا اللہ تعالیٰ کی مادی نعمتیں ہیں۔ ہر خطہ ارض کا باشندہ بلا امتیاز رنگ و نسل ان نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے۔ اگر ایک انسان کی سعی و جہد کا مرکز یہی مادی آسائشیں بن جائیں اور اس کی زندگی روحانی لذتوں سے آشنا تک نہ ہو تو انسان حیوان نما درندہ بن کر اللہ کی زمین پر دندناتا پھرتا ہے اور عالم انسانیت اس کی شرانگیزیوں اور جفاکاریوں سے الامان والحفیظ کی صدائیں بلند کرنے لگتا ہے۔ انسان کو انسان بنانے کے لئے مذہب یا طریقہ زندگی بیش قیمت اثاثہ ہے۔ اور جو مذہب فطری ہو' جس کی تعلیمات عقلی و منطقی ہوں اور جو زندگی کے تمام شعبوں اور دنیا کے تمام گوشوں میں کافی و شافی رہنمائی کرتا ہو' وہ مذہب اپنی ان خصوصیات کی بناء پر آفاقی ہونے کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ تعصب اور جانبداری کی عینک ہٹا کر مذاہب و ادیان کے اس تارامنڈل

پر غور کیا جائے تو اس حقیقت سے انحراف کی گنجائش نہیں رہتی کہ اسلام ہی وہ نظام زندگی ہے جو عالمگیریت و آفاقیت کی تمام تر خصوصیات سے مزین و آراستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی نظام زندگی سے اپنی محبوبیت کا اظہار فرمایا اور اسے تمام بنی نوع انسان کے لئے بہترین دولت قرار دیا۔

اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں میں خدا کا دین جاری و ساری ہو اور دوسرے تمام خود ساختہ اور خانہ ساز افکار و مذاہب پر دین حق کو غلبہ و سرفرازی ہو' یہی خالقِ دو جہاں کو مقصود تھا اور یہی اس کے بندوں کی معراج تھی۔ قرآن پاک میں جب آپ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو دوسرے ادیان و مذاہب کے پس منظر میں اس دین حق کے غلبہ و تفوق کو آپ کی بعثت کا مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ باری تعالیٰ کا فرمان ملاحظہ فرمایئے :

﴿ هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ﴾ (الصف : ۹)

"وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ اسے دوسرے تمام (خود ساختہ اور باطل) ادیان پر غالب کر دے' اگرچہ مشرکین کو یہ ناگوار لگے"۔

اسی مقصدِ بعثت کو قرآن ایک اور جگہ یوں واضح کرتا ہے :

هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ' وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ ﴾ (الفتح : ۲۸)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔

اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ کے دین کا غلبہ و تسلط ہو' یہی اللہ کو مقصود ہے اور یہی ہر مومن صالح کی خواہش ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال فرمانے کے بعد اقامتِ دین یا اظہارِ دین کی گرانبار ذمہ داری اب آپؐ کے امتیوں پر عائد ہوتی ہے۔ دین حق کے فروغ و اشاعت اور غلبہ و کامرانی کی جدوجہد مبارک و مسعود عمل ہے۔ اسی

دین کے قائم کرنے کی تلقین وقت کے ہر پیغمبر کو کی گئی اور اسی دین کی اقامت کی تعلیم نبی آخرالزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔ دنیا کا ہر وہ شخص جو کلمہ طیبہ کے چند مقدس بول بولنے کے بعد اسلام کے حلقے میں داخل ہو جاتا ہے وہ اظہار دین یا اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کا مکلّف ہو جاتا ہے۔ تاہم چونکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بناتا اس لئے فریضہ دین کا دائرہ کار ہر شخص کی صلاحیت و لیاقت کی بنیاد پر متعین ہو گا۔ داعی حق کے ذہن و دماغ میں یہ بات بھی مستحضر رہنی چاہئے کہ دین حق کو غالب کر دینا اور تمام ادیانِ باطلہ پر اسے تفوق و برتری کا مقام دلا دینا اس کی ذمہ داری نہیں ہے' بلکہ اس سلسلے میں سعیٔ مسلسل اور منظم کوشش کرنا ہی اس کی اصل ذمہ داری ہے۔ ہاں جدوجہد کے نتیجہ خیز ہونے کی شکل میں غلبہ و کامرانی کا مبارک منظر بھی دعوتِ نظارہ دے رہا ہو تو یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی وہ نوازش و کرم ہے جس کی بشارت مومنین صالحین کو قرآن پاک میں جگہ جگہ دی گئی ہے۔

قرآن پاک میں "جہاد" بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو خدا کے دین کو سربلند کرنے اور دنیائے انسانیت میں اس کے عام کرنے کے سلسلے میں کی جائیں۔ "فی سبیل اللہ" کی قید میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ اس کوشش اور جدوجہد میں غیراللہ کو خوش کرنے کا جذبہ کارفرما نہ ہو۔ وہ غیراللہ اپنا نفس بھی ہو سکتا ہے' والدین اور دوسرے اعزہ و اقرباء بھی ہو سکتے ہیں' اور معاشرے کے چیدہ افراد اور ارباب سلطنت بھی ہو سکتے ہیں۔ لفظ "جہاد" کی وسعت و ہمہ گیری سے متعلق عالم اسلام کے ایک مشہور و معروف محقق اور قرآن پاک کے ممتاز مفسر کی یہ وضاحت معنی خیز ہے :

> "جہاد کے معنی ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ یہ محض جنگ کا ہم معنی نہیں ہے۔ جنگ کے لئے تو قتال کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جہاد اس سے وسیع تر مفہوم رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے جو ہر وقت اپنے مقصد کی دھن میں لگا ہو' دماغ سے اسی کے لئے تدبیریں کرے' زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے' ہاتھ پاؤں سے اسی کے لئے

دوڑ دھوپ اور محنت کرے۔ اپنے تمام امکانی وسائل اس کو فروغ دینے میں صرف کردے اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے یہاں تک کہ جب جان کی بازی لگانے کی ضرورت ہو تو اس میں بھی دریغ نہ کرے۔ اس کا نام ہے جہاد۔ اور جہاد فی سبیل اللہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لئے اور اس غرض کے لئے کیا جائے کہ اللہ کا دین اس کی زمین پر قائم ہو اور اللہ کا کلمہ سارے کلموں پر غالب آجائے"۔ {۱}

اللہ کے دین کو غالب کرنے کے سلسلے میں داعی حق کو عملی میدان میں جس دشمن سے پہلے سابقہ پیش آتا ہے وہ ہے نفس۔ اگر یہ دشمن اس داعی کے دل و دماغ پر اپنی فتح و تسخیر کے علم گاڑ دے تو پھر اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ہر چہار جانب پھیلے ہوئے اللہ کے باغیوں اور دشمنوں سے محاذ آرائی کرے۔ ہوائے نفس کا بندہ بن کر ایک بندۂ مومن نہ تو ابلیس لعین اور اس کے بے شمار رفقاء سے مقابلہ کر سکتا ہے' نہ شرپسندوں اور فتنہ پروروں سے اور نہ ہی باغی و سرکش حکومت سے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمہ گیر جہاد کی منزل جہاد بالنفس کی پر خار راہوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر جہاد بالنفس کو جہادِ اکبر سے تعبیر کیا تھا اور نفس پر قابو پانے والوں یا نفس امارہ کو شکست سے دوچار کرنے والوں کو زیرک و ہوشیار قرار دیا تھا۔ اس جہاد بالنفس میں یہ شامل ہے کہ ایک طرف ان نفسانی خواہشات کو جو دین و شریعت کے منافی ہوں پامال کیا جائے۔ اس فریضے کی ادائیگی میں کاہلی و کوتاہی' تصنّع و تکلّف اور نمود و اشتہار جیسے سطحی جذبات سے گریز بھی شامل ہے۔ خوشنودیٔ رب کی خاطر اس پر اپنی گرفت قائم رکھنا وہ جوہر ہے جس کی بدولت عملی زندگی کے دیگر شعبوں میں ایک بندۂ مومن فائز المرام ثابت ہوتا ہے۔ اگر بندۂ خدا اطاعت نفس کا خوگر ہو جائے تو اس کے افکار و اعمال میں فساد و فتور لاحق ہو جاتا ہے' محکومانہ ذہنیت اس کا شیوہ و شعار بن جاتی ہے اور وہ زندگی کی دوڑ دھوپ میں عزائم و جذبات کی تروتازگی کے ساتھ حوصلہ افزا یا انقلاب آفریں قدم اٹھانے سے معذور و مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی شخصی زندگی معنوی لحاظ سے بالکل کھوکھلی ہو جاتی ہے اور وہ جہادِ زندگانی میں فتح و کامرانی کا علم اٹھانے

میں یکسر کوتاہ و ناکارہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ بتدریج انسانی اوصاف و خصائل سے عاری ہوتے ہوئے "احسن تقویم" سے "اسفل سافلین" کے مقام تک جا پہنچتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذیل کے ارشاد میں یہی حقیقت ناطق نظر آتی ہے :

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ○ ﴾ (التین : ۴'۵)

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر اسے الٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا"۔

ہوائے نفس کو معبود بنا کر اپنی زندگی کا سفر متعین کرنا جانوروں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر طریقہ زندگی ہے۔ قرآن اس جہت سے ایمان و ایقان اور عمل صالح کی روش اختیار کرنے والوں کو باخبر و چوکنا کرتا ہے :

﴿ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ○ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا ○ ﴾ (الفرقان : ۴۳'۴۴)

"کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو۔ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں"۔

ہوائے نفس کی پیروی ابلیس اور اس کے حواریوں کی رفاقت کا پہلا مرحلہ ہے' یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہوائے نفس کی اطاعت ابلیس اور اس کے رفقاء کی اطاعت و سرافگندگی کی دوسری شکل ہے۔ ابلیس نے بارگاہ رب العزت میں راندۂ درگاہ قرار پا کر اولادِ آدم کو صراطِ مستقیم سے پھیرنے کی قیامت تک کے لئے مہلت مانگی تھی اور پھر اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں تیرے بندوں کو سبز اور ہرے بھرے باغ دکھلا کر بہکاؤں گا۔ قرآن کی زبانی ابلیسِ لعین کی قسم ملاحظہ فرمایئے :

﴿ قَالَ فَبِمَا اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ﴾ (الاعراف :۱۶'۱۷)

"اس نے کہا: اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان کے لئے گھات میں لگا رہوں گا' آگے اور پیچھے' دائیں اور بائیں' ہر طرف سے ان کو گھیروں گا"۔

نفس یا ابلیسِ لعین کی دسیسہ کاریوں اور وسوسہ اندازیوں کے وقت ایک بندۂ مومن کا شعار یہ ہوتا ہے کہ وہ ایمان و ایقان اور صبر و استقلال کی چٹان بن کر اس خالقِ حقیقی کو اپنا ملجأ و ماویٰ قرار دیتا ہے جو لوگوں کا حقیقی پالنہار ہے' نوعِ انسانی کا حاکمِ مطلق اور قیامت تک کے تمام انسانوں کا معبودِ حقیقی ہے۔ یہاں اس کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں کہ ایک بندۂ مومن ان تمام خطرات و وساوس میں ربِّ ذوالجلال کی پناہ کا طلبگار ہو۔ ان سنگین اوقات میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ داعیٔ حق کا جو کردار ہونا چاہئے قرآن اسے اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے :

﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ' اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ ﴾ (الاعراف : ۲۰۰)

اور تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو' یقیناً وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔

اتباعِ نفس کے منحوس و نامبارک اثرات و نتائج کی سنگینی کے پیشِ نظر نفس سے معرکہ آرائی کرنا اور اسے شکستِ فاش دینا دراصل جہاد کے وسیع ترین میدان میں کامیابی کی تمہید ہے۔ اللہ کی راہ میں کماحقہٗ جہاد کا اولین تقاضا یہی ہے کہ نفس یا ہوائے نفس کو اس کا نشانہ بنایا جائے' جبھی ایک بندۂ خدا عملی زندگی کے ہر شعبے میں فتح و ظفر کے پرچم لہرا سکتا ہے۔ "جَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ" کے تحت یہ وضاحت بڑی جامع ہے :

"اس مجاہدے کا اولین ہدف آدمی کا اپنا نفس امارہ ہے جو ہر وقت خدا سے بغاوت

کرنے کے لئے زور لگاتا رہتا ہے اور ہر وقت آدمی کو ایمان و طاعت کی راہ سے ہٹاتا رہتا ہے۔ جب تک اس کو مسخر نہ کر لیا جائے باہر کسی مجاہدے کا امکان نہیں ہے.... اس کے بعد جہاد کا وسیع ترین میدان پوری دنیا ہے' جس میں کام کرنے والی تمام بغاوت کیش' بغاوت آموز اور بغاوت انگیز طاقتوں کے خلاف دل اور دماغ اور جسم اور مال کی ساری قوتوں کے ساتھ سعی و جہد کرنا وہ حقِ جہاد ہے جسے ادا کرنے کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے"۔{۲}

کلمۂ حق پر مبنی انقلابی نظریئے کے دل و زبان سے اعتراف و اقرار کے بعد ہی اہل ایمان خیرِ اُمّت' اُمّتِ وَسَط اور شہداء علی الناس کے القاب و عنایات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ راہ حق میں تمام تر مشکلات سے نبرد آزمائی اور اپنی حیثیت و بساط کے مطابق اس سلسلے میں انتھک جد و جہد' جہاد بالنفس کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے وہ ابتدائی مراحل ہیں جن سے گزرنا ہر داعی حق کا فرض منصبی ہے۔ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی اس جد و جہد کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے موسوم کیا جائے یا اقامت دین کی سعیٔ بلیغ سے بہرحال ہر داعی حق اپنی حیثیت و بساط کے مطابق اس بات کے لئے مکلف ہے کہ دعوت و تبلیغ کی حکمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی کوششیں اس دین کے فروغ و اشاعت کے لئے وقف کر دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ... ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو' اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔

دین اسلام کی قولی شہادت جتنے مؤثر انداز سے اور جتنے بڑے پیمانے پر انجام دی جا سکتی ہو ملت کا ہر فرد حتی الوسع اس کے لئے مکلف ہے۔ یہ دین چونکہ صرف عربوں کے لئے نہیں تھا اور نہ ہی صرف ساڑھے چودہ سو سال پیشتر کے انسانی معاشرے کے لئے تھا بلکہ یہ اللہ کی ایک نعمتِ عظمیٰ ہے اور بطورِ امانت ہمارے پاس ہے' جو بلاشبہ پوری دنیائے انسانیت کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہے۔ اللہ رب العزت کی اس عظیم ترین

دولت کے امین ہونے کی حیثیت سے ہمیں جغرافیائی حدود و قیود سے قطع نظر تمام بنی نوع انسان کو' چاہے وہ کسی بھی خطہ ارض میں رہتے ہوں' اس نعمتِ غیر مترقبہ سے روشناس کرانا ہے۔ نظریاتی اور فکری آویزش کے اس دور میں ہم مخصوص و محدود جغرافیائی خطے میں محصور ہو کر بھی پوری دنیا کو پیغام حق سنا سکتے ہیں اور تاریکیوں سے پھیر کر منارۂ نور دکھلا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم مخاطب کی زبان سمجھیں اور اسی کی زبان میں دعوت پیش کریں۔ اسلام کا مکمل فہم' خشیتِ الٰہی' مروجہ زبانوں میں مہارت اور حکمتِ عملی وہ قیمتی اساسات ہیں جن کی بدولت ایک داعی حق کا معنوی وجود مسلّم اور محترم بن جاتا ہے' اور دوسری طرف یہ اوصاف اس قلمی اور علمی جہاد کا وہ قیمتی اثاثہ ثابت ہوتے ہیں جس کے ذریعے بڑے پیمانے پر دین کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے۔

اسلام کی قولی اور عملی شہادت کی انجام دہی کی راہ میں یا فکری اور علمی جہاد کے مختلف مراحل میں بندۂ مومن کی قوت بھی صرف ہوتی ہے اور وقت اور مال و متاع بھی لگتے ہیں۔ اس پہلو سے اگر دعوت و تبلیغ کے فریضے کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خیر امت' امت وسط اور شہداء علی الناس کے منصب و مقام پر فائز ہوتے ہوئے دین حق کی قولی شہادت انجام دے دی جائے تو ضمنی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کے وہ سارے مراحل طے ہو جاتے ہیں جو اس کی آخری منزل یعنی قتال فی سبیل اللہ سے پیشتر کے ہوتے ہیں۔ (جاری ہے)

حواشی

{۱} ابوالاعلیٰ مودودی' تفہیم القرآن' ج اول' طبع ۱۹۷۱ء' ص ۱۶۶۔
{۲} ابوالاعلیٰ مودودی' تفہیم القرآن' ج اول' طبع ۱۹۶۵ء' ص ۲۵۳۔۲۵۴۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

منصبِ افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں (۴)

تحریر : محمد المکی ناصری' ترجمہ : پروفیسر نور احمد شاہتاز

مفتی سے فتویٰ حاصل کرنے کے مقاصد

جب کوئی سائل یا مستفتی کسی مفتی سے کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا یہ سوال تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت سے خالی نہیں ہوتا :

۱۔ سوال کا مقصد کسی مسئلہ میں واقعتاً اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ مفتی صاحب کا مسلک کیا ہے اور وہ کس امام کے مقلد یا پیروکار ہیں۔

۳۔ یہ معلوم کرنا کہ مفتی صاحب صورت مسئولہ میں اپنے امام مذہب کے قول کو ترجیح دیتے ہیں یا اپنی رائے کو۔

پہلی صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر وہ جانتا ہو اور اسے یقین ہو کہ جو کچھ وہ جواب دے رہا ہے درست ہے' تو وہ سائل یا مستفتی کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے جواب دے کہ اس کے بغیر اس کے پاس چارۂ کار نہیں۔

دوسری صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ مفتی اپنے اس امام مذہب کے قول کے مطابق فتویٰ دے جس کا کہ وہ مقلد یا پیروکار ہے اور اس بات کا اطمینان کرلے کہ جو قول وہ نقل کر رہا ہے وہ واقعی اس امام کا ہے بھی یا نہیں۔ اور یہ کہ آیا وہ قول اس امام کا واقعی مذہب مشہور ہے یا نہیں۔

تیسری صورت میں مفتی کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سائل کو ایسا جواب دے جو پوری محنت اور کوشش کے ساتھ کی گئی تحقیق کے بعد اس کے نزدیک راجح قرار پائے اور جس

کے بارے میں اسے اطمینان ہو جائے کہ یہی صحیح ترین جواب ہے۔ اب اس صورت میں یہ سائل پر لازم نہیں آئے گا کہ اس نے محض قول مفتی پر اعتماد کیا بلکہ اسے فتویٰ پر عمل کرنے میں خوشی محسوس ہوگی کہ یہ خلاصہ تحقیق ہے۔ {۳۹}

مفتی کی بصیرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب اس سے کوئی مستفتی کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں سوال کرے تو مفتی کو چاہئے کہ اگر وہ حرمت کا فتویٰ دے رہا ہو تو اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی بتا دے کہ اس کے مقابل حلال اور جائز امر کیا ہے' تاکہ جب سائل پر ممنوع و ناجائز کا دروازہ بند ہو تو ساتھ ہی جائز اور مباح کا دروازہ کھل جائے۔ ابن القیم کہتے ہیں : "اس طرح کا عمل کوئی زیرک اور شفیق عالم ہی کر سکتا ہے جسے منجانب اللہ توفیق نصیب ہو۔ اللہ اس کے نصیحت کرنے اور اس کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے والے کو اجر عطا فرمائے"۔ علماء میں اس طرح کا عالم ایک طبیب حاذق کی مانند ہے کہ جو مریض کو ایسی اشیاء کے استعمال سے روکتا ہے جو نقصان دہ ہوں اور ایسی اشیاء کے استعمال کی ہدایت دیتا ہے جو مفید ہوں۔ {۴۰}

ابو البقاء الحسینی کہتے ہیں کہ جہاں تک علم و ارشاد کا تعلق ہے تو معلم کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ایک طبیب کی مانند ہو جو مریض کو شفایاب کرنے کے سلسلہ میں سرتوڑ کوشش کرتا ہے اور ایسا نسخہ اور علاج تجویز کرتا ہے جو مرض کے مطابق ہو' نہ کہ مریض کے بتانے کے موافق۔ {۴۱}

آدابِ سوال و سائل

مستفتی کو ایسی حالت میں مفتی سے سوال نہ کرنا چاہئے جب مفتی پریشان ہو' یا کسی کام کو جانے کے لئے تیار ہو' یا کسی سوچ اور خیال میں گم ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ سائل کے سوال پر پوری توجہ نہ دے پائے گا اور نہ ہی صحیح طور پر جواب دے سکے گا۔ {۴۲}

مستفتی کو کوئی ایسا مسئلہ دریافت نہ کرنا چاہئے جو فی الواقع پیش ہی نہ آیا ہو یا نادر الوقوع ہو' یا دور از کار ہو۔ اسی طرح ایک عام مستفتی کو کسی ایسی چیز کے بارے میں نہ پوچھنا چاہئے جو اس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہو۔ اور اگر وہ اس قسم کے سوالات میں

الجھے الجھائے تو مفتی کو چاہئے کہ وہ اس کے سوال سے صرف نظر(Ignore) کرے اور اسے کوئی جواب نہ دے۔ ہاں اگر مستفتی کا مقصد اس سوال سے ایسے معاملات کا علم حاصل کرنا ہو جو اسے پیش نہیں آتے مگر وہ انہیں تحصیل علم و تفقہ کی نیت سے اور اس خیال سے جاننا چاہتا ہے کہ جب کبھی اس طرح کے معاملات پیش آئیں تو پہلے ہی سے وہ جواب جانتا ہو یا اس سے ملتے جلتے مسائل پر ان جوابات کا اطلاق کر سکے تو ایسے مستفتی کو کافی و شافی جواب دیا جائے گا۔

اگر سوال کا سبب پیچیدہ مسائل یا متشابہات ہوں جس سے مستفتی کے ذہن میں شبہات نے جنم لیا ہو اور اس کا ارادہ ان شبہات کے ازالہ کا ہو جن میں اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا ہو تو اس صورت میں مفتی کو چاہئے کہ وہ انتہائی شفقت سے مستفتی کا ذہن صاف کرے اور ایسا اسلوب اختیار کرے جو مستفتی کے ذہن اور عقل کو اپیل کرے کیونکہ مخلوق خدا کی ہدایت اہل علم پر فرض ہے' جیسا کہ القرافی نے کہا ہے کہ جہاں کہیں بھی جواب کی مصلحت راجح ہو وہی اولیٰ ہے جیسا کہ ابن القیم نے بھی کہا ہے۔ {۴۳}

سوال کیسے (Put-Up) کیا جائے

اگر مستفتی پر کوئی آفت ایسی آن پڑے جس کا حل وہ شریعت کے حکم سے چاہتا ہو اور اس کے شہر میں کئی مفتی ہوں اور وہ تمام مفتیوں کے جوابات ایک ہی کاغذ پر حاصل کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ ایک بڑے سائز کا کاغذ لے جس پر تمام مفتیوں کے جوابات لکھے جا سکیں۔ پھر ادب و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جوابات کے سلسلہ میں سب سے پہلے عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ صاحب علم سے رجوع کرے' پھر ان کے بعد درجہ بدرجہ دیگر مفتی صاحبان کے پاس اپنا سوال لے جائے۔ اور اگر وہ متعدد کاغذوں پر مختلف مفتیوں کی آراء و فتاوی حاصل کرنا چاہتا ہو تو پھر سوال کی نقول جسے چاہے پہلے بھیج دے اور جس کے پاس چاہے بعد میں لے جائے۔ البتہ کاغذ اتنا بڑا ہو کہ سوال کے بعد اس پر مفتی مکمل فتویٰ تحریر کر سکے۔

سائل یا مستفتی کو چاہئے کہ وہ اپنا سوال اس انداز سے لکھے کہ اس سے اس کا مطلب پوری طرح واضح ہو اور جس مقصد کے لئے اس نے سوال لکھا ہے وہ پورا ہو سکے۔ اسی

طرح الفاظ واضح اور جلی قلم سے لکھے ہوں۔ ان میں کوئی پیچیدگی اور ہیر پھیر نہ ہو۔ اگر سائل ایک عام سا شخص ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا سوال کسی ایسے شخص سے لکھوائے جو پڑھا لکھا ہو' تا کہ سوال خوش اسلوبی سے لکھا اور پیش کیا جا سکے۔ {۴۴}

جواب کیسے مرتّب کیا جائے

سائل کے سوال کی حدود اور حاجت کے مطابق جواب دیا جائے اور سوال کی عبارت میں کوئی اضافہ کیا جائے نہ اس کے موضوع میں۔ جواب مختلف اقوال اور اختلافات کے ذکر سے خالی ہونا چاہئے' کیونکہ مختلف اقوال ذکر کرنے سے مستفتی کے ذہن میں تشویش پیدا ہوگی اور وہ یہ نہ سمجھ سکے گا کہ کس قول پر عمل کرے---- جواب دوٹوک' واضح اور حصول مقصد کے لئے کافی ہونا چاہئے تا کہ اس کے ساتھ کسی اور بات کی ضرورت نہ رہے۔ {۴۵} اگر مستفتی نے صرف رہنمائی کی خاطر سوال کیا ہو تو اس کے سوال کا صرف مختصر جواب ہی کافی ہوگا۔ اس کے ساتھ دلائل اور حوالہ جات نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر یہ توقع ہو کہ جواب پر اعتراض یا اشکال وارد ہوگا تو پھر دلائل اور حوالہ جات جواب کے اندر ہی ذکر کرنے چاہئیں تا کہ جو کوئی حقیقت امر جاننا چاہے وہ حق اور صواب جان لے {۴۶} السمیری نے کہا ہے : "اگر کوئی عام آدمی سائل ہو تو دلیل ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اور اگر کوئی پڑھا لکھا سوال کرے تو دلیل ذکر کر دی جائے {۴۷}۔

القرافی نے کہا ہے کہ جب استفتاء کسی بڑے واقعہ سے متعلق ہو جو دین کے کسی اہم معاملہ یا مسلمانوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو تو مفتی کو چاہئے کہ وہ مفصل جواب لکھے' اور حق واضح کرنے کے لئے مبالغہ سے کام لے اور فوراً سمجھ میں آنے والے دلائل ذکر کرے تا کہ فوائد حاصل اور مفاسد دور ہوں' اور ایسے دلائل ذکر کئے جائیں جو شرعی / قانونی مفادات کو تحفظ فراہم کریں۔ مذکورہ صورت کے علاوہ اس قسم کا جواب لکھنے کی ضرورت نہیں {۴۸}۔

ابن القیم کہتے ہیں کہ جواب میں دلیل اور اس کے حوالہ جات کا حتی الامکان ذکر ہونا چاہئے اور مستفتی کو بالکل روکھا اور پھیکا اور بلا دلیل و حوالہ فتویٰ نہ دینا چاہئے۔ اس رائے

پر نبی اکرم ﷺ کے بعض فتاویٰ سے استدلال کیا گیا ہے {۴۹} ابن القیم کا کہنا ہے کہ مفتی کو سائل کے سوال سے زیادہ جواب دینا جائز ہے {۵۰} اور انہوں نے اس پر صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب سے استدلال کیا ہے جو حسب ذیل ہے "باب من اجاب السائل باکثر مما سال عنہ" یعنی سائل کو سوال سے زیادہ جواب دینا۔

رہا معاملہ یہ کہ جواب کیسے لکھا جائے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ جواب لکھتے وقت یہ خیال رکھا جانا ضروری ہے کہ جواب میں کسی اور کی طرف سے کسی اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی جائے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور شخص اس جواب میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کر دے جو اس جواب کے برعکس ہو یا گمراہ کن ہو' چنانچہ جواب کی تحریر میں نہ تو بین السطور کوئی جگہ چھوڑی جائے اور نہ کوئی نقص رہنے دیا جائے۔ اور مفتی کو ایک ہی قلم اور خط سے فتویٰ تحریر کرنا چاہئے کیونکہ خط بدلنے یا قلم بدلنے سے کسی کو فتویٰ میں جعل سازی و تزویر کا موقع مل سکتا ہے۔ خط واضح ہونا چاہئے نہ زیادہ باریک نہ زیادہ بڑا بڑا کہ پڑھنے والے کو دشواری ہو یا ناگوار گزرے۔ {۵۱}

القرافی کہتے ہیں کہ اس طرح کی احتیاطی تدابیر کرنا ضروری ہے اور کسی قسم کی بدظنی' جعل سازی وغیرہ کے راستے مسدود کرنا عمدہ اسلوب ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "دَعْ مَا یُرِیبُکَ اِلٰی مَا لَا یُرِیبُکَ" {۵۲}

مفتی کس قسم کا اضافہ کر سکتا ہے؟

اگر مستفتی یا سائل کا سوال ایسا عجیب ہو کہ جو غیر مانوس سا ہو تو مفتی کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک دم سے سائل کو ٹکا سا جواب دے دے بلکہ اسے چاہئے کہ وہ پہلے مقدمہ کے طور پر تمہید باندھے تاکہ سائل جواب سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی پوزیشن میں آجائے اور اس جواب پر عمل کرنے کو ذہنی طور پر تیار ہو جائے {۵۳}۔ اگر سوال کا جواب ایسا ہو کہ جس سے سائل کے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو مفتی کو چاہئے کہ وہ سائل کو متنبہ (خبردار) کرے تاکہ اس کا خیال اور ذہن غلط فہمی کی جانب نہ جائے۔ {۵۴} اگر سائل کے سوال میں کسی نص قرآن و سنت کا حوالہ دیا گیا ہو تو مفتی کو چاہئے کہ وہ اپنے فتویٰ میں بھی

اس نص کو نقل کرے اور جہاں تک ممکن ہو نص کے الفاظ ذکر کرے۔ کیونکہ جو نص بھی شارع کے حوالہ سے ذکر ہوئی ہوگی اس میں کسی حکم کا بیان ہو گا۔ علاوہ ازیں اس میں حکم اور دلیل مذکور ہوں گے جو کہ موقع کی مناسبت سے ہوں گے اور ظاہر ہے کہ کسی بھی موضوع پر مذکور نص خطاء' تناقض اور اضطراب سے پاک ہوتی ہے۔ {۵۵}

اگر سائل نے کسی خاص مسئلہ کے بارے میں سوال کیا ہو اور مفتی یہ محسوس کرے کہ اس کے سوال کو مزید اہم اور سود مند بنانے کے لئے اس میں کچھ اضافہ ضروری ہے تو وہ اپنے جواب میں اس طرح اضافہ کرے کہ سائل کا سوال بھی ضمناً آ جائے اور جواب مفصل' جامع اور مفید تر ہو جائے۔ اگر اس طرح کیا جائے تو یہ فتویٰ کے کمالات میں سے اور مفتی کے ذی علم ہونے کی دلیل و علامت ہو گا۔ اسی طرح یہ اس بات کی بھی دلیل ہو گا کہ مفتی خیر خواہ ہے اور سائل کو اس نے بڑی خوش اسلوبی سے مطمئن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں جو عمدہ مثال پیش کی جا سکتی ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ایک سوال کو بیان کرنے کا بہترین انداز ہے۔ فرمایا: "يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ" (اے نبی ﷺ) "لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟" پھر اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "قُلْ مَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ' وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝" (اے نبی ﷺ) "آپ فرما دیجئے کہ حسن سلوک کے طور پر تم جو مال بھی خرچ کرو تو وہ ماں باپ' قریبی رشتہ داروں' یتیموں' محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے۔ اور تم جو نیکی کرو تو بے شک اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔

انداز جواب اور اسلوب دیکھئے کہ صرف اتنا بتا دینے کی بجائے کہ مسلمان کیا خرچ کریں' وہ تمام مصارف بھی بیان کر دیئے کہ جہاں جہاں مسلمانوں کو خرچ کرنا چاہئے {۵۶} اور اس مخصوص سوال کا جواب بھی اللہ نے مختصراً اس طرح دے دیا کہ "قُلِ الْعَفْوَ" یعنی "آپ فرما دیجئے کہ جو بھی زائد از ضرورت ہو"۔ (جاری ہے)

(حواشی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

محاضراتِ قرآنی بعنوان :

افکار و پیغامِ اقبال اور قیامِ پاکستان اور انقلابِ ایران اور پاکستان میں دستورِ خلافت کی تکمیل

تحریر : انور علی بخاری

جناب انور علی بخاری شعبہ تعلیم سے منسلک ہیں۔ پاکستان کی چوٹی کی جامعات میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے مرکزی انجمن خدام القرآن کے تحت منعقد ہونے والے مختلف سیمینارز' دروس قرآن اور بالخصوص محاضرات قرآنی میں نہایت پابندی اور اہتمام سے شرکت کرتے ہیں۔ ہماری درخواست پر انہوں نے حالیہ محاضرات قرآنی کی ایک ایسی تاثراتی رپورٹ مرتب کی ہے جس کے ذریعے محاضرات میں پیش کئے گئے مقالات کا ایک خلاصہ بھی عمدگی کے ساتھ قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔ (ادارہ)

سالانہ محاضرات قرآنی کا انعقاد اب انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کی ایک مستقل روایت بن چکی ہے جس کا بہت ذوق و شوق کے ساتھ انتظار کیا جاتا ہے۔ اراکین انجمن اور تنظیم اسلامی کے رفقاء کے علاوہ جو ملک کے طول و عرض سے اپنے سالانہ کنونشن میں شرکت کے لئے اس دوران لاہور میں آئے ہوتے ہیں' اہل لاہور کا ایک وسیع طبقہ بھی ان محاضرات میں شرکت کرتا ہے۔ یہ بات محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مساعی کی کامیابی کی ایک واضح علامت ہے کہ سامعین میں دانشور' ہوش مند اور دیندار اصحاب کے علاوہ تنقیدی اور ایسا ذہن رکھنے والے حضرات بھی بہت بڑی تعداد میں موجود ہوتے ہیں جو کمال ضبط و تنظیم کے اور مکمل انہماک و استحضار کے ساتھ مقررین کی تقاریر اور دانشوروں کے مقالات کو سنتے ہیں۔ پچھلے چند سالوں سے اگر ان محاضرات میں

پڑھے جانے والے مقالات اور ان میں کی جانے والی تقاریر کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بخوبی سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے موضوعات کا انتخاب بہت متنوع اور وقیع رہا ہے۔ ان محاضرات میں خالصتاً دینی موضوعات کے علاوہ حالات حاضرہ اور مسلم اُمّہ کو درپیش مسائل کی مناسبت سے معاشی' معاشرتی اور عمرانی مسائل بھی ایک سنجیدہ اور باوقار ماحول میں زیر بحث آتے ہیں جن سے ایک طرف تو سننے والوں کی تعلیم و تربیت کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف سوچ و بچار کرنے والے اذہان کے لئے فکر کی نئی راہیں متعین ہوتی رہتی ہیں۔

اس بار یہ محاضرات 20'21 اور 22/اپریل کو قرآن کالج کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئے جو مقررین کی تقاریر اور ان کے مقالات کے اساسی جوہر کے اعتبار سے بھی اور سامعین و حاضرین کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ ان کے ذوق و شوق اور انہماک و استحضار کے اعتبار سے بھی بہت کامیاب رہے۔

موضوعات جن پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی وہ تھے' اقبال ڈے کی مناسبت سے "افکار و پیغام اقبال اور قیام پاکستان و انقلاب ایران" اور پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر اور اس مملکت خداداد کی غرض و غایت کی مناسبت سے "پاکستان میں دستور خلافت کی تکمیل"! ـــــ ان موضوعات پر مندرجہ ذیل حضرات نے تقاریر کیں یا مقالے پڑھے۔

☆ 20/اپریل : ڈاکٹر محمود احمد غازی' ڈاکٹر وحید الزمان اور ڈاکٹر آفتاب اصغر

☆ 21/اپریل : علامہ شبیر بخاری' پروفیسر محمد طفیل سالک' صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی' مولانا محمد اسحٰق بھٹی اور جناب عمران این حسین

☆ 22/اپریل : ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن سابق چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان۔

یوں تو یہ دونوں موضوعات اپنی الگ الگ حیثیت سے بھی بہت اہم تھے لیکن اساسی اعتبار سے یہ ایک ہی موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے تھے اور وہ موضوع تھا اسلامی انقلاب کی فکری بنیاد اور عملی طور پر اس انقلاب سے حاصل ہونے والے ممالک میں اسلامی حکومت کا انعقاد و استحکام۔ یہ بات بہت وضاحت سے بیان ہوئی کہ پاکستان اور

ایران (اسلامی انقلاب کے بعد کا ایران) وہ دو ممالک ہیں جن کے قیام کے لئے فکر اقبال نے مواد فراہم کیا۔

ڈاکٹر وحید الزمان اور ڈاکٹر آفتاب اصغر نے خصوصیت کے ساتھ انقلاب ایران کے فکری ماخذ کی تحقیق پیش کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جناب آیت اللہ خمینی نے جن ایرانی ذہنوں کی تعلیم و تربیت کر کے وہ انقلاب برپا کیا جس کی ہیئت تمام مغربی ممالک اور بالخصوص امریکہ پر طاری ہو گئی ہے۔ اور وہ اب اسلام کو اپنا واحد مدمقابل جاننے اور ماننے لگے ہیں اور جس کے خلاف ہر سطح پر وہ برسرپیکار نظر آتے ہیں' ان ذہنوں کی آبیاری کرنے میں تین مفکرین کی مساعی خاص طور پر شامل ہیں اور یہ کہ موجودہ ایرانی قیادت ان تینوں مفکرین کی مساعی اور اس تحریک کے فکری منہاج متعین کرنے میں ان تینوں کے رول کو تسلیم بھی کرتی ہے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتی ہے اور وہ ہیں سید جمال الدین افغانی' ڈاکٹر علی شریعتی اور حضرت اقبال لاہوری یعنی ہمارے اپنے علامہ اقبال۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر آفتاب اصغر کا مقالہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ انہوں نے اقبال کی فارسی شاعری سے بیش بہا مواد پیش کیا اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے لئے بھی یہ بات ایک انکشاف سے کم نہیں ہے کہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری اپنے اندر حریت فکر اور تحریکِ شعورِ ذات کا کس قدر آتش فشاں لئے ہوئے ہے۔ اقبال جو فلسفہ خودی کے علمبردار تھے اور عظمت انسانی کے تمام نشان قرآن کریم سے اخذ کرتے تھے انہوں نے کس طرح جمود و تقلید کے خلاف آواز بلند کی اور نوجوان ذہن کو یہ انقلابی پیغام دیا کہ وہ اپنی فکر میں تحریک و حریت کے اوصاف پیدا کر کے ہی اپنی خودی کی تکمیل کر سکتا ہے اور اپنے شایان شان سیاسی معاشی و معاشرتی نظام قائم کر سکتا ہے جو کہ اس عظمت انسانی کے عین مطابق ہو جو اسلامی اور قرآنی فکر اس کے لئے متعین کرتی ہے۔ کاش کہ ہمارے اربابِ بست و کشاد مطالعہ پاکستان کے مضمون میں تحریک پاکستان کے سیاسی پس منظر کے ساتھ ساتھ ہمارے نوجوانوں کو اقبال کی شاعری اور بالخصوص اقبال کی فارسی شاعری کا ایک ایسا انتخاب لازمی پڑھائیں جس نے ایرانی نوجوان ذہن کو اس انداز سے اور اس وقت سے تحریک دی کہ انہوں نے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی تاریخ میں پہلی بار ایک انقلابی اسلامی ریاست

قائم کر کے دکھا دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر آفتاب اصغر کا یہ مقالہ چھپ کر ہمارے نوجوان ذہنوں تک ضرور پہنچنا چاہئے تا کہ ان میں بھی تحریک پیدا ہو کہ وہ مطالعہ فکر اقبال کے خوگر ہوں اور اس کے ذریعہ قرآن حکیم کی طرف راغب ہوں کیونکہ صرف اور صرف فکر قرآنی ہی ہمیں عبد سے عبدہ تک لے جا سکتی ہے۔

مولانا محمد اسحٰق بھٹی نے شہر لاہور میں منعقد ہونے والے دروس قرآن کریم کا ایک بھرپور جائزہ پیش کیا اور خیال ظاہر کیا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مساعی اس ضمن میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآنی میں جو فکری منہج اختیار کیا گیا ہے وہ ایک خالص مُلّا کا منہج نہیں ہے بلکہ ایسا جدید اور مؤثر منہج ہے جو ماڈرن تعلیم یافتہ ذہن کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریک اسلامی کے تمام مناہج سیرت مطہرہ کے بہت عمیق مطالعہ سے اخذ کئے ہیں اور اس تحریک میں شامل خواتین و حضرات کا ذہن تیار کرنے کے لئے انہوں نے بھی اقبال کے ہی انداز میں محرک و مؤثر تعلیماتِ قرآنی کا استعمال کیا ہے جس سے کہ ایک صالح و باعمل افرادی قوت حاصل ہو سکتی ہے جو بالآخر اس انقلاب کا ہراول دستہ بنے گی جو بالاخر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پر منتج ہو گی۔

جناب عمران این حسین کا بھی یہی تجزیہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایران کے بعد اب جغرافیائی لہر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پاکستان بالآخر اس انقلاب کی آماجگاہ بن جائے جس کے لئے کہ اس مملکت کا وجود وقوع پذیر ہوا تھا اور یہ کہ برعظیم اور بالخصوص پاکستان میں مختلف مذاہب فکر کی باہمی رقابت اور چپقلش کی موجودگی میں یہاں اسلامی انقلاب کٹر مذہبی قیادت نہیں لا سکتی بلکہ وہ انقلاب ایک محرک اور ماڈرن ذہن کی دیندار اور فہیم قیادت ہی برپا کرے گی اور شاید کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر اسرار سے ہی یہ کام مقدر کروا دے۔

افکار و پیغام اقبال اور قیام پاکستان کی حد تک تقریباً ہر مقرر نے اظہار خیال کیا اور اقبال کی فارسی شاعری سے استدلال قائم کرتے ہوئے کہا کہ اقبال ایک شاعر انقلاب تھے جن کی شاعری اور دیگر افکار سے متاثر ہو کر مسلمانان ہند ایک عوامی تحریک و آئینی جدوجہد کے بعد پاکستان قائم کیا جو اس حیثیت سے ایک انقلابی ملک ہے کہ اس کا وجود

خالصتاً ایک اسلامی ملک کے طور پر ہوا ہے۔ ملک و قوم کے مروجہ اساسی محکمات سے ہٹ کر یہ قوم وحدت دین کی بنیاد پر ایک قوم تسلیم کی گئی اور یہ ملک خالصتاً اسلام کے نفاذ کے لئے قائم کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے آئین کی ترویج سے بھی بہت پہلے اس ملک کی آئین ساز اسمبلی نے ایک قرارداد مقاصد منظور کی جس میں یہ عہد کیا گیا کہ اس ملک میں اقتدار اعلیٰ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ہے اور ہو گا اور اس میں تمام قوانین قرآن و سُنّت کے مطابق ہی بنائے جا سکیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک عرصۂ دراز تک یہ قرارداد مقاصد آئین کا حصہ نہ بنائی گئی۔ ضیاء الحق مرحوم کے زمانہ اقتدار میں قرارداد مقاصد آرٹیکل 2A کے ذریعے آئین کا مؤثر حصہ بن گئی۔ لیکن اس کے بعد بھی پاکستان میں اسلامی اقدار کا نفاذ اور ملک کے قوانین میں ایسی دفعات جو صریحاً پوری طرح سے یا جزوی طور پر اسلامی قوانین کی روح سے متصادم تھیں ان میں تبدیلیاں لانے کے لئے اخلاص نیت سے اور دیانتداری سے اقدام نہیں کئے گئے اور ہنوز یہی روش جاری ہے۔ یوں تو پاکستان کے ہر آئین میں ایسے ادارے قائم کرنے کا اعلان کیا گیا اور ایسی دفعات بتدریج شامل کی جاتی رہیں جن سے بظاہر اسلامی حکومت کے قیام کی طرف پیش قدمی نظر آتی ہے لیکن یہ تمام بے ضرر اور نمائشی اقدام ہی رہے کیونکہ خلوص دل سے یہ چاہا ہی نہیں گیا کہ ایک فلاحی اسلامی مملکت بالفعل وجود میں لائی جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا ادارہ ہو یا وفاقی شرعی عدالت کا قیام ہو ان کی تجویز و تشکیل ہی اس انداز سے کی گئی کہ ان کی سفارشات یا ان کے فیصلے سنجیدگی سے لئے ہی نہ جائیں۔ اس دلخراش حقیقت کو دو فاضل مقررین نے بہت شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر محمود احمد غازی تھے جنہوں نے بہت تفصیل سے یہ بتایا کہ اسلامی نظریاتی کونسل جو 1973ء کے آئین میں تشکیل دی گئی تھی اور اس کے پیش رو ادارے جو 1956ء اور 1962ء کے آئین میں قائم کئے گئے تھے ان تمام اداروں نے ملک کے مختلف قوانین کا بہت تفصیلی جائزہ لے کر اسلامائزیشن کے لئے بہت قابل قدر سفارشات مرتب کر کے اب تک قائم ہونے والی ہر پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیں، لیکن یہ سفارشات اس حد تک بھی درخور اعتناء نہ سمجھی گئیں کہ ان پر غور و خوض یا بحث و مباحثہ ہی کر لیا جاتا، چہ جائیکہ عملاً ان سفارشات کی روشنی میں ملکی قوانین

میں تبدیلیاں لائی جاتیں۔ فاضل مقرر نے بہت دکھ سے بتایا کہ اس کونسل کی رپورٹیں بہت آسانی سے کباڑیوں کی دکانوں سے ردی کے طور پر مل جاتی ہیں' حالانکہ یہ رپورٹیں پارلیمنٹ میں پیش ہو جانے کے بعد State Document کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ اسی بات سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے پارلیمنٹیرین ان ضخیم رپورٹوں کو جن میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں عملی تجاویز اور سفارشات مرتب تھیں' اور جو ان نمائندوں کی Guidance کے لئے تھیں' انہیں یہ نمائندے ردی کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے رہے ہیں۔ ایسے میں کیا توقع قائم کی جاسکتی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ذریعے اسلامائزیشن کا مقصد حاصل ہو سکے گا جب تک کہ اس کونسل کی سفارشات کو موثر کرنے کا کوئی نظام وضع نہیں کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں دیگر تجاویز کے علاوہ انقلاب ایران کے بعد کے ایرانی آئین میں اختیار کئے گئے ایک اقدام کا جائزہ لیا جا سکتا ہے جس کی رو سے ایرانی پارلیمان میں ایک تیسرا Chamber بھی قائم کیا گیا ہے جو کسی موجودہ قانون کے بارے میں کہ یہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں حتمی فیصلہ کرنے کا مجاز ہے اور اگر یہ ادارہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ موجودہ قانون جو پہلے ہی پارلیمنٹ کے ہر دو Chambers سے پاس ہو چکا ہے قرآن و سنت سے کسی معمولی اعتبار سے بھی مطابقت نہیں رکھتا تو اسے ویٹو کر سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایران میں اس ادارے نے کبھی ویٹو کا حق استعمال بھی کیا ہے یا نہیں' لیکن یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آئین کے تحت ایسا کوئی ادارہ وجود رکھتا ہو اور اس کو بالفعل اس قسم کا موثر اختیار بھی حاصل ہو تو اس کی موجودگی ہی پارلیمنٹ پر ایک بہت موثر چیک ثابت ہو گی۔

پاکستان میں بھی کوئی ایسی آئینی سکیم وضع کی جاسکتی ہے جس کے تحت قومی اسمبلی اور سینٹ جو قانون بھی بنائے تو اس قانون کے قرآن و سنت کے مطابق ہونے کے بارے میں اس قانون کے پاس ہو جانے سے پہلے ہی اس پر حتمی رائے سامنے آجائے جس کی موجودگی میں کوئی ایسا قانون پاس نہ ہو جو قرآن و سنت سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے اور اس ادارے کی تشکیل نو بھی ہو سکتی ہے اس طرح کہ اس میں دینی علوم میں دسترس رکھنے والے علماء کے علاوہ دوسرے علوم

کے ماہر بھی شامل کئے جاسکتے ہیں' تا کہ کسی بھی مجوزہ قانون کا ہر اعتبار سے مکمل جائزہ لیا جا سکے' اس لئے کہ جب یہ تجویز کردہ قانون ملک کا باقاعدہ قانون بنے تو اس کے ہر پہلو پر نظریاتی قانونی اور عملی اعتبارات سے قابل قبول اور قابل عمل ہونے کا یقین حاصل ہو۔ مزید یہ کہ قومی اسمبلی اور سینٹ کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ ان کی طرف سے تجویز کردہ ہر مسودہ قانون پر اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ عوام الناس کی اطلاع کے لئے نشر بھی کی جائے اور قومی اسمبلی یا سینٹ خود بھی اس کی پابند ہو کہ منفی رپورٹ کی صورت میں تجویز کردہ مسودہ میں ترامیم کرنے اور اسے ہر طرح سے قابل قبول بنانے کے بعد ہی ملک کا قانون بنایا جائے۔

دوسرے مقرر جنہوں نے آئین پاکستان کا بھرپور اور ہمہ جہتی تجزیہ پیش کیا اس نقطہ نگاہ سے کہ قرار دادِ مقاصد میں دیئے گئے مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ میں اور دستور پاکستان میں دی گئی ایسی دفعات کو موثر بنانے کے لئے کیا کیا اقدام ضروری ہیں جن سے کم از کم یہ مقاصد تو حاصل ہو سکیں کہ ہمارے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ڈھل جائیں جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب تھے جو وفاقی شرعی عدالت پاکستان کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں اور اپنی ذات میں ایک متبحر عالم اور مستند قانون دان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک بھرپور مقالہ پیش کیا۔ ان کے اس مقالہ کی اہمیت کے پیش نظر اور اس لئے بھی کہ ان کا یہ مقالہ تنظیم اسلامی کی موجودہ جدوجہد کے سلسلہ میں جو وہ آئین میں مطالبہ تکمیل دستور خلافت کے سلسلہ میں کر رہی ہے' بہت معاون ثابت ہو گا اور اس میں اختیار کردہ فکر بھی اور طرز استدلال بھی تنظیم کے اختیار کردہ پروگرام سے ہر طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ مقالہ خصوصی طور پر 22/اپریل کو پیش کیا گیا۔ محاضرات کا انعقاد 20 اور 21/اپریل تک محدود تھا لیکن اس پروگرام میں ایک دن کی توسیع کر دی گئی تا کہ یہ خصوصی مقالہ پوری یکسوئی سے سنا جاسکے۔ اور حق یہ ہے کہ یہ فیصلہ بہت ہی درست تھا کیونکہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کا یہ مقالہ ایک سابق چیف جسٹس کے تبحر علمی کا ہر طرح سے آئینہ دار تھا۔ مقالہ انگریزی زبان میں تحریر کیا گیا تھا لیکن سامعین کی سہولت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خصوصی درخواست پر جسٹس صاحب نے اسے بزبان اردو پیش کیا۔ مقالہ

نگار نے بہت تفصیل سے یہ بات واضح کی کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد سے اب تک ہمارے مختلف دساتیر میں کس طرح ایسی دفعات بتدریج شامل ہوتی رہیں جن سے کہ ایک اسلامی مملکت کے قیام کے خدوخال متعین ہوتے ہیں۔ اور ایسے ادارے بنائے جاتے رہے کہ جو ایک اسلامی ریاست کے لئے ضروری قانون سازی کے کام میں ممد و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن دکھ کی بات ہے کہ جہاں ایک طرف آئین میں ایسی دفعات کا شمول اور ان دفعات کے تابع بنائے جانے والے ادارے امید کے چراغ روشن کرتے رہے وہاں دوسری طرف آئین میں ایسی دفعات بھی شامل رہیں جن کی موجودگی میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت ممکن ہی نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت وضاحت سے اسلامی دفعات گنوائیں اور پھر انہی دفعات میں موجود ان ذیلی شقوں کی بھی نشاندہی کی جن کی موجودگی میں وہ اسلامی دفعات غیر موثر ہو جاتی ہیں۔ اور جہاں ایسا نہیں ہے وہاں اداروں کی تشکیل تو بہت طمطراق کے ساتھ ہوتی رہی ہے لیکن ان اداروں کا کام درخور اعتنانہ سمجھا گیا اور ان اداروں کا وہ کام جو بہت محنت سے کیا گیا' عدم توجہ کی وجہ سے معرض التوا میں پڑا رہا۔ اس قسم کا سلوک اسلامی نظریاتی کونسل کے ساتھ روا رکھا گیا حالانکہ یہ وہ واحد ادارہ تھا جس کے ذریعے مملکت پاکستان میں نافذ ہر قانون کو اسلامی احکام کی روشنی میں درست بھی کیا جا سکتا تھا اور نئی قانون سازی کے سلسلہ میں اس ادارہ سے رہنمائی بھی حاصل کی جا سکتی تھی۔

دوسرا معتبر ادارہ جو ضیاء الحق صاحب کے دور اقتدار میں بہت دھوم دھام سے قائم کیا گیا وہ وفاقی شرعی عدالت کا ادارہ تھا۔ لیکن اس کی تخلیق کے وقت ہی اس پر بہت زیادہ پابندیاں لگا دی گئیں اور ایسے اداروں اور قوانین کو اس عدالت کے اختیارات سے باہر رہنے دیا گیا کہ جن کی اصلاح اور تدوین نو کے بغیر نہ ہماری معیشت نہ معاشرت اور نہ ہی عدالتی نظام کسی بھی اعتبار سے اسلامائیز کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئین پاکستان میں شامل اسلامی دفعات محض نمائشی ہیں اور صاحبان اقتدار نے کبھی بھی پورے اخلاص سے یہ نہیں چاہا کہ اس ملک میں اسلام کا بالفعل نفاذ عمل میں آئے۔ وفاقی شرعی عدالت کے خالق نے بھی اس ادارے کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا نہ ہی اسے آزادانہ کام کرنے کا

موقع فراہم کیا گیا نہ ہی اس ادارے کے بنچ کی تشکیل آئین میں دیئے گئے طریق کار اور شرائط کے مطابق کبھی کی گئی۔ بلکہ یہ بات قارئین کرام کے علم میں ہوگی کہ ابھی پچھلے سال ہی جب حکومت پاکستان اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے درمیان ججوں کی تقرری کے طریق کار کے بارے اختلاف رائے بہت گھمبیر طریقہ سے سامنے آیا تھا اور جس کو بعد میں 20 مارچ 1996ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے حتمی طور پر حل کر دیا تھا اس دوران اہل وطن کو یہ معلوم ہوا کہ دراصل وفاقی شرعی عدالت کے ادارے کو متعدد حکومتوں نے ایک ایسے ادارے کے طور پر استعمال کیا جہاں ججوں کی تقرریاں اکثر و بیشتر اس انداز سے کی جاتی تھیں کہ وہ جج جن کو منظور نظر نہ سمجھا جاتا تھا ان کو ایک طرح سے سزا کے طور پر وفاقی شرعی عدالت میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جسٹس صاحب کا یہ مقالہ سچ یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کی موجودہ مہم برائے تکمیل دستور خلافت کے مطالبات کو مبنی برحق ثابت کرتا ہے اور یہ بات اب اظہر من شمس ہو گئی ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کی تشکیل' اس کے اختیارات اور اس کے دائرہ کار کو اگر پورے دائرہ حکومت پر محیط نہ کیا گیا اور اس کے ججوں کے تقرر اور ان کی مدت کار کو اگر ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان کی طرح تحفظ اور آزادی نہ دی گئی تو اس ملک میں اسلامی نظام قانون بس ایک خواب ہی رہ جائے گا۔

تحریک خلافت کے مطالبات سے تو ہم آگاہ ہیں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے جو ترامیم آئین میں لانے کی سفارشات کی ہے وہ اجمالی طور پر حسب ذیل ہیں۔ میں نے ان شفارشات کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔ درست Text کے لئے مقالہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

1۔ وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار میں جو رکاوٹ اس وقت آئین میں بذریعہ 203(ب) موجود ہے اسے ختم کیا جائے۔

2۔ وفاقی شرعی عدالت میں ججوں کی تعداد 11 کی جائے جن میں سے 5 علماء جج ہوں اور پوری کوشش کی جائے کہ ججوں کی یہ مطلوبہ تعداد موجود رہے' بالخصوص 5 علماء جج۔

3۔ وفاقی شرعی عدالت کے ججوں کی تقرری کی مدت Fix کی جائے اور ان کی تقرری کی شرائط اور دیگر حالات کار ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان کے مساوی بنائی جائیں۔

4۔ وفاقی شرعی عدالت کے دو بنچ تشکیل دے جائیں۔ ایک اوریجنل سائڈ پر اور دوسرا اپیلیٹ سائڈ پر کام کرے۔

5۔ وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے کاموں میں Duplicacy کو ہٹایا جائے تا کہ دونوں ادارے اپنا اپنا متعین اور مثبت کام انجام دیں۔

6۔ آئین کے آرٹیکل 2A کے ضمن میں ایک دفعہ "B" کا اضافہ کیا جائے جس کے تحت آئین کی کوئی دفعہ / کوئی ملکی قانون یا کوئی ایسا معروف جو قانون جیسی قوت رکھتا ہو ان میں کوئی بات جس حد تک کہ وہ آرٹیکل 2A (یعنی قرار داد مقاصد) سے Inconsistent ہو اسے void قرار دیا جاسکے۔

7۔ آئین میں ایسی شقیں جو آئین کے دوسرے آرٹیکل سے متصادم ہوں انہیں ختم کیا جائے تا کہ آئین کے کسی بھی آرٹیکل کے آزادانہ اور منصفانہ استعمال پر کوئی قدغن نہ رہے۔

یوں تو آئین پاکستان میں کئی دفعات اسلامی دفعات شمار کی جاسکتی ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ مندرجہ ذیل اہم ہیں تو ان دفعات پر ضروری غور و خوض کرنا ہوگا اور انہیں مزید مؤثر اور بہتر بنانا ہوگا۔ آرٹیکل 2A (قرار داد مقاصد) 227 سے 230 اسلامی نظریاتی کونسل، 203 وفاقی شرعی عدالت 62 اور 113 قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران کی اہلیت سے متعلق دفعات۔

ہمارا مطالبہ، ہماری اپیل
دستورِ خلافت کی تکمیل

قرآن اکیڈمی ملتان کے شب و روز

مرتب : ڈاکٹر محمد طاہر خان خاکوانی

الحمد للہ والمنہ کہ انجمن خدام القرآن ملتان اپنے پیش نظر مقاصد کے لحاظ سے ترقی پذیر ہے۔ انجمن خدام القران کے زیر اہتمام امسال بھی حسب معمول ماہ صیام میں تین مقامات پر تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن مکمل کیا گیا۔ گارڈن ٹاؤن ملتان کینٹ میں یہ سعادت راقم الحروف کے حصہ میں آئی۔ جبکہ قرآن اکیڈمی ملتان میں محترم مختار حسین فاروقی صاحب نے دورۂ ترجمہ قرآن نہایت کامیابی سے مکمل کیا۔ نیو ملتان میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے وڈیو کیسٹ کے ذریعے یہ پروگرام منعقد کیا گیا اور مجوزہ نصاب کو دیکھنے اور سننے کے بعد نماز تراویح ادا کی جاتی رہی۔ تینوں مقامات پر شرکاء کی قابل لحاظ تعداد نے پوری دلچسپی اور انہماک سے پروگرام میں شرکت فرمائی۔ گارڈن ٹاؤن اور قرآن اکیڈمی میں خواتین بھی شریک پروگرام رہیں اور بھرپور استفادہ کیا۔

جیسا کہ قارئین "حکمت قرآن" کے علم میں ہے کہ محترم خواتین کو عربی پڑھانے کے لئے ایک کلاس کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ۲۵ خواتین نے پابندی وقت کے ساتھ شرکت کی اور عربی زبان سیکھی۔ انہی خواتین کے لئے یکم مارچ ۹۷ء سے منتخب نصاب کی تعلیم کا اعلان کیا گیا۔ الحمد للہ کہ ۳۵/۳۰ خواتین نے اس کلاس میں داخلہ لیا' جو پوری دلچسپی کے ساتھ راقم الحروف سے فہم قرآن کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ قرآن کریم کے منتخب حصوں سے دین کی اصل حقیقت' دین کے مطالبات اور ان کا باہمی ربط و تعلق بلیک بورڈ کی مدد سے پڑھایا اور سمجھایا جا رہا ہے۔ فہم قرآن کے اس پروگرام کا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ماشاء اللہ خواتین کے سامنے دین کے جو جو مطالبات آ رہے ہیں محترم خواتین ان پر عمل درآمد میں بھی پیش قدمی کر رہی ہیں۔ ۳۰/۲۵ خواتین زیر تعلیم ہیں۔

یکم مارچ ہی سے مرد حضرات کے لئے بھی عربی کلاس کا اہتمام کیا گیا۔ اسی کلاس کے شرکاء میں ایسے مرد حضرات جو خواتین کو ساتھ لے کر آتے ہیں کے علاوہ چند دیگر احباب نے بھی داخلہ لیا ہے۔ اس کلاس کو محترم ڈاکٹر منظور حسین صاحب عربی پڑھا رہے ہیں۔ اس کلاس کے شرکاء کی تعداد ابتدا میں تو ۲۰ تھی مگر رفتہ رفتہ اب کم ہوتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے قرآن فہمی کی جانب اہل ملتان کی دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے اس کام میں مزید خلوص

عطا فرمائے اور اہل ملتان کو اس عظیم کام کی جانب متوجہ فرمائے۔

خطاباتِ جمعہ و دروس ہائے قرآن (ماہانہ' پندرہ روزہ' ہفتہ وار) کے ذریعے بھی لوگوں کو قرآن و سنت کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ محترم فاروقی صاحب کا ایک درس قرآن ڈسٹرکٹ کونسل ہال (ایئر کنڈیشنڈ) میں ماہانہ بنیادوں پر بھی ہوتا ہے' جس میں ایسے احباب کو approach کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو بعض وجوہ کی بنا پر مساجد کا رخ نہیں کرتے۔

شعبۂ حفظ : شعبہ حفظ قرآن میں ۲۵ طلبہ زیر تعلیم ہیں جن کو قاری محمد شاہد صاحب بڑی محنت سے حفظ قرآن کی تعلیم دیتے ہیں۔

شعبۂ تجوید : شعبہ تجوید میں لگ بھگ ۳۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ استاد محترم قاری محمد نعمان صاحب بڑی جانفشانی سے تجوید پڑھاتے ہیں۔

مکتبہ : انجمن کے زیر اہتمام شعبہ سمع و بصر بھی ماشاء اللہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ کتب' جرائد' ویڈیو' آڈیو کیسٹس برائے فروخت موجود ہیں۔ اور نماز جمعہ کے وقت باقاعدگی سے سٹال لگایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بھی ہفتہ کے چھ دنوں میں مکتبہ کھلا رہتا ہے۔

لائبریری : صبح و شام کے اوقات میں انجمن کے زیر اہتمام کتب' آڈیو' ویڈیو کیسٹس لائبریری سے احباب استفادہ فرما رہے ہیں۔

حواشی بسلسلہ : منصب افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں

{۳۹} ابن القیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۵۳

{۴۰} ایضاً ص ۱۹۸

{۴۱} ابو البقاء' کلیات' ص ۳۶۸' ۳۶۹

{۴۲} النووی' المجموع' ج ۱' ص ۵۷

{۴۳} القرافی' الاحکام' ص ۲۸۲' ۲۸۳۔ ابن القیم' الاعلام' ج ۴' ص ۱۹۳۔ النووی' المجموع ج ۱' ص ۴۵

{۴۴} النووی' المجموع' ج ۱' ص ۵۷

{۴۵} ابن القیم' الاعلام' ج ۴' ص ۱۵۷

{۴۶} القرافی' الاحکام ص ۲۵۷' ۲۶۶' ۲۶۸

{۴۷} النووی' المجموع' ج ۱' ص ۵۲

{۴۸} القرافی' الاحکام' ص ۲۶۹

{۴۹} ابن القیم' الاعلام' ج ۴' ص ۱۴۰' ۱۴۱

{۵۰} ایضاً ج ۴' ص ۱۳۸

{۵۱} القرافی' الاحکام' ص ۲۵۱' ۲۵۴' ۲۶۴

{۵۲} ایضاً---ص ۲۵۱۔ الطبرانی' المعجم الکبیر' والسیوطی' المعجم الصغیر

{۵۳} ابن القیم' الاعلام ج ۴' ص ۱۴۲' ۱۴۳

{۵۴} ایضاً---ج ۴' ص ۱۳۹

{۵۵} ایضاً---ج ۴' ص ۱۴۸

{۵۶} ایضاً---ج ۴' ص ۱۳۷

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں "بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر" کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

جو کئی سال سے آؤٹ آف پرنٹ تھی'

اب اس کتاب کا نیا نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے' جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے :

- فکر اقبال کی روشنی میں حالات حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں
  از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد
- حیات و سیرت اقبال
- فلسفہ اقبال
- ملت اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام
  از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم
- اقبال اور قرآن' از قلم : سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت' دیدہ زیب طباعت' صفحات ۱۴۴

قیمت : اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے

اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن